راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۴واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

Monthly Arxang Lahore

جون 2012ء

جلد: 14 شمارہ: 6

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی

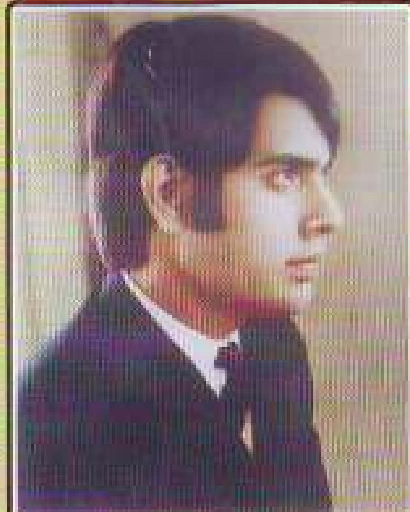

خیاؔلی

چوہدری عابد علی جو مصوری کی دُنیا میں خیاؔلی کے نام سے اپنی پہچان رکھتے ہیں 24 دسمبر 1942ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری خدا بخش ریلوے میں ملازم تھے۔ شروع سے ہی طبیعت فطرت اور حسن کی طرف مائل تھی۔ مصور تو اندر موجود تھا بس اُستاد محترم حاؔلی صاحب نے فالتو پتھر ہٹایا تو فن کی مورتی باہر نکل آئی۔ خیاؔلی صاحب 57 سال سے مصوری میں اپنے فن کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں پینٹنگز اور خطاطی کے شاہکار تخلیق کر چکے ہیں۔ صرف کلمہ طیبہ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خطاطی کے شاہکار کی تعداد بیس ہزار سے زائد ہے۔ قائداعظم، علامہ اقبالؒ اور نشانِ حیدر کے شہداء کی مشہورِ زمانہ پورٹریٹ خیاؔلی صاحب کے بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلا رنگدار قاعدہ بھی انہوں نے بنایا اور سرورق کی ابتدا شیخ غلام علی اینڈ سنز کے ساتھ ہوئی۔ اگر اس ادارہ کے کتب کی تعداد دس ہزار ہے تو 9 ہزار کتب کے ٹائٹل خیاؔلی نے تخلیق کیے ہیں۔ بقول خیاؔلی صاحب آج تک حکومتی سطح پر میرے فن کا اعتراف نہیں کیا گیا اور نہ ہی کوئی ایوارڈ ملا۔ ہاں غالب کی سوسالہ برسی پر تین ماہ کی شب و روز محنت کے بعد میں نے ''نوائے سروش'' کا سرورق تیار کیا۔ اس کتاب کو ایوارڈ ملا مگر ادارے نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ نہ ہی آج تک عوامی سطح پر میرے اعزاز میں کوئی تقریب منعقد ہوئی ہے۔ بقول خیالی صاحب آرٹسٹ کو ہر تصویر بناتے ہوئے مشکل درپیش ہوتی ہے مگر جب وہ برش پکڑتا ہے تو مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

"اور مت پردہ پوشی کرو سچ کی جھوٹ سے نہ چھپاؤ سچائی کو جب تم جانتے ہو"۔ (القرآن)

MONTHLY ARXANG LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 14 جون 2012ء شمارہ نمبر 6

حمدیہ کلام	خالد علیم ' ۲
نعتیہ کلام	عبدالمجید چٹھہ ' ۳
مضامین / خاکہ......سیّد ضمیر جعفری	عطاء الحق قاسمی ' ۴
غالب کی شوخیاں	جمیل یوسف ' ۶
عامر بن علی کی کتاب "محبت کے دو رنگ"	امتیاز علی اسد ' ۱۰
حسن عباسی کا سفرنامہ بھارت	امجد علی شاکر ' ۱۱
آہ اُستاد پرنم الہ آبادی	محمد اقبال پیام شجاع آبادی ' ۱۳
طنز و مزاح / بونا نہیں بے وقوف	حافظ مظفر محسن ' ۱۴
افسانے / انجلی	رانا خادم علی انجم ' ۱۷
آئیڈیل کی تلاش	انصر علی بریار ' ۱۹
یادوں کی دُھند	دستگیر شہزاد ' ۲۳

انٹرویو / سلیمان جاذب سے عامر بن علی کی گفتگو

ایڈیٹر کی ڈائری / حسن عباسی

شعری گوشے

جان کاشمیری، جمشید مسرور، عباس تابش، ڈاکٹر صغریٰ صدف، خالد خواجہ، نصرت صدیقی، آصف ثاقب، علی رضا، شہزاد نیر، اختر رضا سلیمی، شہاب صفدر، سعید عاصم، ارشد شاہین، احمد خیال، اسد اعوان، شبیر نازش، اعجاز فیروز اعجاز، راشد امین، سیّد کامی شاہ، کامران اقبال اعظم، راؤ وحید حسن، صائمہ ملک، خاور نعیم بٹ، امجد اقبال امجد ۲۵ تا ۴۸

متفرق غزلیات ' ۴۹

تبصرۂ کتب ۵۱

نامہ ہائے احباب ۵۵

مدیر

حسن عباسی

مدیران اعزازی

ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم

ڈپٹی ایڈیٹرز (اعزازی): زبیر بشیر، صفدر علی صفدر (کویت)

اسسٹنٹ ایڈیٹر: کامران ندیم

زرِ سالانہ مبلغ 1000 روپے

برائے خط و کتابت

نستعلیق پبلی کیشنز

الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

0092+423+7351963 / 0300-4489310

E.Mail: arzangpk@yahoo.com

FAR EAST MARKETING CO.

SAMARIA MANSION 605 KOENJI-MINAMI 1-6-5,

SUGINAMI-KU, TOKYO, 166-0003, JAPAN

E-MAIL: femc1@hotmail.com

عامر حسین پبلشرز نے زاہد بشیر پریس ریتی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا۔

خالد علیم/لاہور

رخشندہ چراغِ انجمن تو نے کیا   صحرا کو ہمسرِ چمن تو نے کیا

جناب خالد علیم کی غیر معمولی قدرت کلام ہر ادب پرست قاری کو متاثر کرتی ہے- انہوں نے متعدد اساتذہ فن کی زمینوں اور متعدد مشہور و معروف قصیدوں یا شعری شاہکاروں کے تسلسل میں دادِ سخن دی ہے اور اپنے نقوش کمال کی آب و تاب کو کہیں مدھم نہیں ہونے دیا- وہ مشکل اور کم مروج زمینوں اور بحروں میں بھی بڑی کامیابی اور حیرت انگیز سہولت کے ساتھ تخلیق فن کی منزلیں قطع کرتے ہیں- انہوں نے مردف زمینوں میں بھی متوجہ کرنے والے شعر نکالے ہیں- پابند و آزاد فنی ہئیتیں ان کے وجدانی ریموٹ کنٹرول کے اشاروں کی فوری اور بلا تامل اطاعت کرتی ہیں- جناب خالد کی حمدیہ و نعتیہ رباعیاں بھی ایک خاص شان رکھتی ہیں- رفعت فن اور تقدس موضوع کے حوالے سے یہ رباعیاں ہمیں رباعیاتِ امجد حیدر آبادی کی یاد دلاتی ہیں- جعفر بلوچ (مرحوم)

اے ربِ ذوالجلال! روشن کر دے
مولائے لایزال! روشن کر دے
ہوں سر بہ سجود میں فقط تیرے حضور
مجھ پر اپنا جمال روشن کر دے

تو عالمِ بے حصار میں ایک سراب
تو قلزمِ بے کنار میں ایک حباب
ہیں تیرے طلوع سے ازل اور ابد
ہے میرے غروب سے زمانوں کا حجاب

ہر ایک گلِ شگفتہ غماز ترا
غنچے کی چٹک میں نغمۂ ساز ترا
واللیلِ اِذا سجیٰ ادا ہے تیری
والصبحِ اذا تنفس انداز ترا

عالم میں تمام دلکشائی ہے تری
ہر سمت محیط کبریائی ہے تری
جو دیکھ رہا ہوں وہ تری حکمت ہے
جو دیکھ نہ پاؤں وہ خدائی ہے تری

رخشندہ چراغِ انجمن تو نے کیا
صحرا کو ہمسرِ چمن تو نے کیا
پانی کو کیا ہے تو نے آئینہ صفت
پتھر کو گوہرِ عدن تو نے کیا

پھولوں میں مہک بن کے اُترتا ہے تو
ہر غنچہ و گل میں رنگ بھرتا ہے تو
ہر روز سمیٹ کر ردائے اسود
ہر صبح کرن کرن بکھرتا ہے تو

اندھوں کو بصارتیں عطا کرتا ہے
بہروں کو سماعتیں عطا کرتا ہے
دیتا ہے قوتیں تو معذوروں کو
نادانوں کو حکمتیں عطا کرتا ہے

سورج کو پئے غروب لے جاتا ہے
چادر تاریکیوں کی پھیلاتا ہے
بکھرا کے سحر کا نور گلشن گلشن
ہر پیکرِ گل میں جان دوڑاتا ہے

محروم کو دولت کرم دیتا ہے
محکوم کو قوت و حشم دیتا ہے
دینے جو لگے تو ایک قطرے کے عوض
تو بحر بہ بحر، یم بہ یم دیتا ہے

حاصل ہے مجھے نشاط پیہم تجھ سے
پرنور ہے میری چشم پرنم تجھ سے
زندہ میں ترے بغیر کس طرح رہوں
رشتہ ہر سانس کا ہے محکم تجھ سے

مردوں کو لطف زندگانی بخشے
پیری کو دولت جوانی بخشے
قطرے کو جو چاہے تو سمندر کر دے
ٹھہرے ہوئے پانی کو روانی بخشے

راتوں کو دنوں میں ڈھالتا ہے کوئی
ظلمت سے مجھے نکالتا ہے کوئی
گرتا ہوں میں بار بار لیکن خالد
ہر بار مجھے سنبھالتا ہے کوئی

عبدالمجید چٹھہ/لاہور

میں کہ مُفلس نہیں بے سہارا نہیں
دولتِ حبِ احمدؐ میرے پاس ہے

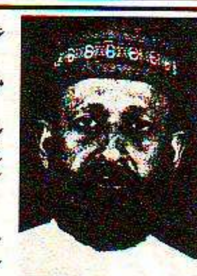

عبدالمجید چٹھہ کا ہر شعر عشق رسولؐ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ دیارِ رسولؐ کی جو منظر کشی کرتے ہیں وہ عقیدت کے زینے اور حقیقت نگاری کی منزل کی خبر دیتی ہے۔ اس سے پیشتر اُن کی چار کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ''لاریب'' ان کی پانچویں کتاب ہے۔ کتاب کیا جواہر پارے ہیں جن کے حرف حرف میں تجلی کی کرنیں اور عقیدت کی مہک بسی ہوئی ہے۔ وہ شعر اس روانی سے کہتے ہیں کہ اتنی جلدی گفتگو بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ کمال بہت کم لوگوں کو حاصل ہے اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ عبدالمجید چٹھہ کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ چٹھہ صاحب خوش فکر بھی ہیں، خوش گلو بھی ہیں اور سچے عشق رسولؐ کے حوالے سے خوش نصیب بھی۔ وہ اچھے انسان ہیں اور انہیں اچھا کہنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ وہ علم دوست بھی ہیں انسان دوست بھی۔ (اقبال راہی)

بہارو! مرے گھر کے آنگن میں آؤ
میں آقاؐ کی محفل سجانے لگا ہوں
ہواؤ! ذرا دھیرے دھیرے گزرنا
میں خوشیوں کی شمعیں جلانے لگا ہوں
نہیں ہے سہارا سوا اُنؐ کے کوئی
دُکھوں کا مداوا سوا اُنؐ کے کوئی
خبر ہو نہ جائے زمانے کو میری
میں چُھپ چُھپ کے آنسو بہانے لگا ہوں
زمانہ خدارا نہ ہم کو ستائے
سمجھ کر بھکاری نہ ہم کو رُلائے
حضورؐ اپنی رحمت نچھاور کریں گے
دریدہ ہی دامن بچھانے لگا ہوں
ضعیفی نے ڈھانپا مرے جسم و جاں کو
بتاؤں گا کچھ بھی نہ میں آسماں کو
مرے ہم نشینو! نہ دلگیر ہونا
میں زخموں سے پردہ اُٹھانے لگا ہوں
مدینے میں ہم تو تہی دست آئے
نبیؐ نے خزانے خدا کے لُٹائے
ستاروں سے جھولی مقدر نے بھر لی
میں نورانی کرنوں میں آنے لگا ہوں
حُبِ مصطفیٰؐ کی دُعا مانگتا ہوں
کرم کی مجید اب رِدا مانگتا ہوں
مرے گھر میں ہی تو حضورؐ آ رہے ہیں
لکھی ہیں جو نعتیں سنانے لگا ہوں

مجھے رحمتوں نے گھیرا، بادل جو غم کے چھائے
محبوبِؐ کبریا ہی، محبوبؐ بن کے آئے
میں تو کھڑا ہوا ہوں دنیا میں پورے قد سے
جب تھام لیں محمد ﷺ دُنیا گرا نہ پائے
وحشت ٹپک رہی تھی، تاریک زندگی میں
پھر آ کے مصطفیٰؐ نے کیا چاند ہیں لگائے
سرکارؐ کی بدولت، ہوئی آشنائی ربّ سے
جب آپؐ زندگی کی معراج بن کے آئے
سرکارؐ چل سکوں گا اِک گام میں نہ یاں سے
جائیں حضورؐ جائیں جبریلؑ مسکرائے
دُنیا میں تم مجید اب، بے آسرا نہیں ہو
چلتے ہو مجتبیٰؐ کے تم آج سائے سائے

میں کہ مُفلس نہیں بے سہارا نہیں
دولتِ حبِ احمدؐ میرے پاس ہے
زندگانی سے ہوں کیوں پریشان میں
راحتِ حُبِ احمدؐ میرے پاس ہے
فسق کے پنجے گاڑھے یہاں دہر نے
مجھ کو تھاما ہے آخر نبیؐ نے مرے
چاہے مجھ کو گوارا کرے مت جہاں
چاہتِ حُبِ احمدؐ میرے پاس ہے
جان و دل جانِ جاں حُسنِ یوسف کہاں
آپؐ کے نور سے ہیں یہ روشن جہاں
ماسوا اُنؐ کے کوئی معظم نہیں
عظمتِ حُبِ احمدؐ میرے پاس ہے
ذِکر اُس کا مری روح کا آئینہ
نام اُس کا مری زیست کا چاندنا
دِل کے سارے نہاں خانوں میں ہیں وہیؐ
اُلفتِ حُبِ احمدؐ میرے پاس ہے

مدینے کو دل میرا جانے لگا ہے
محبت کی محفل سجانے لگا ہے
رواں سوئے طیبہ ہے دل دھیرے دھیرے
یہ بستی وفا کی بسانے لگا ہے
یہ تھا میرا ذکرِ محمد ﷺ سے پہلے
مرے ہاتھوں سے اب یہ جانے لگا ہے
حقیقت میں تو ہے یہ اِک لوتھڑا سا
مگر مرتبہ کیا یہ پانے لگا ہے
یہ ہے دیدہ ور بے بہا مشکلوں کا
خوشی سے یہ نغمے سنانے لگا ہے
فِضا میں مدینے کی بستے ہیں جو بھی
جگہ ایسے لوگوں میں پانے لگا ہے
مجید آج ہے جن کے دم سے یہ دُنیا
یہ اُنؐ کو تصور میں لانے لگا ہے

خاکہ

سیّد ضمیر جعفری

عطاء الحق قاسمی

مزاح نگار، شاعر، ڈراما نگار، کالم نویس، سفرنامہ نگار، مدیر، سفارت کار، معلم اور خوبصورت دل کے مالک عطاء الحق قاسمی کی شخصیت کی ''پرزم'' سے یہ صفات شعاعوں کی مانند منعکس ہوتی ہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں کہ ان میں سے کسی کو ایک آدھ بھی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ جبکہ عطاء الحق قاسمی یہ سب کچھ ہے اور اس کے باوجود اس کے پاؤں زمین پر ہیں۔ دماغ چوتھے آسمان تک نہ پہنچا...... یاروں کا یار۔ عطاء الحق قاسمی ان چند استثنائی شخصیات میں سے جنہوں نے عفت قلم کی قسم اُٹھائی اور اسے نبھایا بھی اور وہ بھی سرکار کا ملازم ہوتے ہوئے۔ بطور کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے اپنی باریک بینی کے بعد سب سے زیادہ کام کاٹ دار اسلوب سے لیا ہے ایسا کارگر اسلوب کہ گہری سے گہری بات چند جملوں میں کہہ جاتا ہے اور ایسا مؤثر اسلوب کہ ہدف بھی مسکرا دے۔ (ڈاکٹر سلیم اختر)

تین بزرگ ادب میں اور دو بزرگ صحافت میں ایسے ہیں، جن کے کام کرنے کی استعداد دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، میں جن بزرگوں کا ذکر کرنے لگا ہوں یہ سب کے سب کم و بیش ستر کے پیٹے میں ہیں اور یہ عمر ایسی ہے کہ یار لوگ اس عمر کے لوگوں کو اٹھتے بیٹھتے اللہ اللہ کرنے کے مشورے دیتے رہتے ہیں، بہر حال بزرگانِ ادب میں سے ڈاکٹر سید عبداللہ، احمد ندیم قاسمی اور سید ضمیر جعفری کچھ اس قسم کے بزرگ ہیں کہ اس پیرانہ سالی میں ان کے کام کی مقدار اور معیار دیکھ کر ہم مبینہ نوجوانوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح بزرگانِ صحافت میں سے دو بزرگ مجھے اکثر حیران کرتے ہیں، اور یہ اپنے بابا وقار انبالوی اور نصر اللہ خاں ہیں۔ وقار انبالوی تو قریباً نوے برس کے ہیں۔ موصوف روزانہ شرقپور سے لاہور آتے ہیں اور ظاہر ہے واپس بھی جاتے ہوں گے، اس کے علاوہ روزانہ ایک بلند پایہ طنزیہ کالم اور ایک قطعہ لکھتے ہیں۔ جناب نصر اللہ خاں کراچی کے ایک اخبار سے وابستہ ہیں اور ان کی عمر پینسٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ گویا عمر کے لحاظ سے انہیں بابا وقار انبالوی کا ''برخوردار'' کہا جا سکتا ہے اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ قطعہ نگاری میں اس وقت وقار انبالوی کا کوئی حریف نہیں، جب کہ نصر اللہ خاں پاکستان کے سب سے بڑے شگفتہ سیاسی کالم نگار ہیں۔ تاہم اس وقت میں بزرگوں کی ''ہتھ جوڑی'' کرانے کے لئے یہ سطور نہیں لکھ رہا، بلکہ اس وقت تو میرے ''ہدف'' پیر و مرشد ضمیر جعفری ہیں، جنہیں مجھ ایسے ''مریدانِ باصفا'' اور امجد اسلام امجد ایسے ''مریدانِ بال صفا'' پیر و مرشدان کی ''پیری'' کے حوالے سے نہیں، مزاحیہ ادب میں ان کی ''مضبوط گدی'' کی وجہ سے مانتے ہیں۔ امجد اسلام امجد جو فقرہ بازی کی ولایت میں خود بھی ایک اچھا خاصا سجادہ نشین ہے۔ ضمیر صاحب کی اس فیلڈ میں برتری کی وجہ سے بھی انہیں پیر و مرشد مانتا ہے۔ اگر میں یہاں ضمیر صاحب کے جملوں کی داد دینے بیٹھ جاؤں تو میں اپنے ٹریک سے اتر جاؤں گا، مگر کیا حرج ہے اگر تبرک کے طور پر ان کے کچھ جملے یہاں درج کرتا چلوں، مثلاً ایوانِ صدر میں صدر صاحب کی فرمائش پر ضمیر صاحب نے اپنے کچھ اشعار سنائے، تو ابوالاثر حفیظ جالندھری نے جو ضمیر صاحب سے بہت محبت کرتے تھے۔ یونہی چھیڑنے کے لئے کہا: ''اوئے ضمیر تم جب میرے انڈر کام کیا کرتے تھے۔ اس وقت تو تم خاصے بونگے ہوتے تھے''۔ اس پر ضمیر صاحب دست بستہ کھڑے ہو گئے اور کہا ''حفیظ صاحب! یہ سب آپ کی دوری کا فیض ہے!'' ضمیر صاحب ایک روز عبدالعزیز خالد کے مہمان ہوئے اور وہاں کچھ لکھنے کے لئے انہوں نے خالد صاحب سے ان کا قلم مستعار لیا۔ مگر تین چار دفعہ کوشش کے باوجود یہ قلم ان سے نہ چل سکا۔ اس پر انہوں نے خالد صاحب کو قلم واپس کرتے ہوئے کہا ''یہ آپ رکھ لیجئے۔ اسے غالباً آسان اردو لکھنے کی پریکٹس نہیں ہے''۔ رمضان کے مہینے میں ضمیر صاحب اپنے گھر میں اپنی مصنوعی بتیسی اتارے اپنے ایک مہمان سے بات چیت کر رہے تھے جس کے نتیجے میں گفتگو کم اور ''ڈینٹیشن'' زیادہ ہو رہی تھی۔ اس پر مہمان نے عرض کی کہ جناب! آپ نے یہ بتیسی اتاری کیوں ہوئی ہے جس پر ضمیر صاحب نے کہا، ''چونکہ رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ منہ میں بتیسی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میری مانیں تو آپ بھی اپنی بتیسی اتار لیں!''

متحدہ عرب امارات کے مشاعروں میں ضمیر صاحب اور میں اکٹھے تھے۔ دوبئی سے العین جاتے ہوئے قریباً سو میل کے لق و دق صحرا سے گزرتے ہوئے ضمیر صاحب کی باغ و بہار شخصیت کے کئی پہلو سامنے آئے۔ ان چٹیل میدانوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جہاں نہ کوئی بندہ اور نہ کوئی بندے دی ذات تھی۔ ضمیر صاحب نے مجھے مخاطب کیا اور کہا ''ہم تاریخ کتابوں میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں فاتح نے دنوں میں سینکڑوں میل کا علاقہ فتح کر لیا۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا، مگر آج یہ علاقہ دیکھ کر یقین آ گیا ہے کہ وہ واقعی دنوں میں سینکڑوں میل کے علاقے فتح کر لیتے ہوں گے!''

اور خواتین و حضرات! آپ نے دیکھا ہو گا کہ کچھ لوگ جو اپنی گفتگو سے کشتِ زعفران بنا دیتے ہیں۔ جب لوگوں کے جھانسے میں آ کر مزاح لکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو مرزا ظفر الحسن بن جاتے ہیں اور کچھ جو بے حد شگفتہ نگار ہوتے ہیں ان سے گفتگو کریں تو پندرہ بیس منٹوں میں ابا سیاں آنے لگتی ہیں۔ مگر اپنے ضمیر صاحب ان معدودے چند مزاح نگاروں میں سے ہیں، جن کی تحریر اور گفتگو کی شگفتگی یکساں طور پر مخاطب کو اپنی گرفت میں لئے رکھتی ہے، میں نے ایک بار ضمیر صاحب کی مزاحیہ شاعری کے بارے میں لکھا تھا کہ اکبرالٰہ آبادی کے بعد ضمیر جعفری اردو کی مزاحیہ شاعری میں سب سے قد آور شخصیت ہیں اور اپنے اس بیان پر آج بھی قائم ہوں، فوری ثبوت کے لئے فی الحال یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمارے مسائل کو آسان کر
برزنیف کو یارب مسلمان کر

حضرت اقبال کا شاہیں تو ہم سے اُڑ چکا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

برپا ہم سال میں اک مجلسِ اقبال کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوال کرتے ہیں

ہم کہاں بوئے گئے تھے اور کہاں پیدا ہوئے
خُلد سے نکلے تو در سانده کلاں پیدا ہوئے

اوراب اگر سچ پوچھیں تو مجھے ضمیر صاحب کی شگفتہ طبعی اوران کے نثری اور شعری مزاحیہ ادب کے بارے میں رائے دینے کی چنداں ضرورت نہ تھی، کیونکہ مجھ سمیت سبھی لوگ ان علاقوں کو ضمیر صاحب کے مفتوحہ علاقے سمجھتے ہیں اوران پر ضمیر صاحب کا قبضہ اتنا مستحکم ہے کہ ان علاقوں پر اب کوئی ''سرحدی تنازعہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اصل موضوع گفتگو تو ضمیر صاحب کی سنجیدہ شاعری ہونا چاہیے جس پر ابھی نقادانِ فن نے اتنی توجہ نہیں فرمائی جتنی توجہ کی یہ مستحق تھی اور خود میں بھی اس پر زیادہ اظہارِ خیال نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں نقاد نہیں شریف آدمی ہوں۔ تاہم اس ضمن میں مجھے اتنا ضرور کہنا ہے کہ ضمیر صاحب ہنسانے ہی پر نہیں، رُلانے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل ٹیکسلا کے مشاعرے میں جو اشعار ضمیر صاحب نے پڑھے، اس میں ایک شعر ایسا بھی تھا جسے سن کر مجھ پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ اس شعر میں جبر کی فضا اور اس فضا میں لکھنے والوں کے مسائل کے حوالے سے انہوں نے ایک بات کچھ اتنے مؤثر انداز میں کہی کہ یہ شعر میرے شعور کا حصہ بن گیا۔ یہ شعر آپ بھی سنئے!

اے عزیزانِ فردا، تمہیں کیا خبر
ہم سے جیسے بھی لکھا گیا، لکھ دیا

اتنا دردناک اور اتنا پختہ شعر ضمیر صاحب ہی کہہ سکتے تھے کہ آنسو زیادہ ہنسنے والوں ہی کی آنکھوں سے بہتے ہیں۔ ویسے اس شعر کے دوسرے مصرعے سے ایک لفظ اگر تبدیل کر دیا جائے تو یہ شعر آج کے بہت سے لکھنے والوں پر بھی منطبق ہو سکتا ہے۔ یعنی ان کے لئے یہ شعر یوں ہوسکتا ہے کہ

اے عزیزانِ فردا، تمہیں کیا خبر
ہم سے ''جیسا'' بھی لکھا گیا، لکھ دیا

خیر یہ پیروڈی تو خواہ مخواہ درمیان میں آ گئی۔ مجھے کہنا یہ تھا کہ ضمیر صاحب کی غزلیں اتنی خوبصورت ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے مزاح نگار ضمیر جعفری یوں درمیان میں سے نکل جاتا ہے جس طرح مزاح نگار جعفری کو پڑھتے ہوئے غزل گو ضمیر جعفری کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ مگر میں اس موضوع پر ابھی کچھ باتیں اور بھی کرنا چاہتا تھا، مگر مجھے کچھ باتیں ابھی ضمیر صاحب کی قومی اور ملی شاعری کے حوالے سے بھی کرنا ہیں اور شاعری کا یہ وہ میدان ہے جس میں ضمیر صاحب اس عہد کے باقی نغمہ نگاروں سے یکسر مختلف نظر آتے ہیں۔ یہ بات میں یوں کہہ رہا ہوں کہ ضمیر صاحب نے ایسی شاعری میں طبع آزمائی کرتے ہوئے جس میں نعرہ بازی کی خاصی گنجائش ہے، نعرہ بازی نہیں کی۔ ان کے قومی نغمے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروڈیوسروں کی فرمائش میں ڈوبے ہوئے نہیں۔ عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وطن ان کے لئے محبوب کی طرح ہے چنانچہ ان کی غزلوں اوران کے قومی نغموں کی لَے ایک ہی ہے۔ سو ''لہو ترنگ'' کے بعد ''زبورِ وطن'' میں جو ضمیر جعفری ہمیں نظر آتا ہے وہ وہی ضمیر جعفری ہے جو غزلوں میں اپنے محبوب کی بلائیں لیتا نظر آتا ہے!

اوراب آخر میں مجھے ضمیر صاحب کے لئے دعا کرنی ہے کہ خدا انہیں نظر بد سے بچائے کیونکہ اس تحریر کے آغاز میں، میں نے منہ پھاڑ کر اس امر پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ضمیر صاحب اس عمر میں بھی اس قدر مقداری اور معیاری کام میں لگے ہوئے ہیں اور دعا مجھے اس عمر کے کچھ ان بزرگوں کے بارے میں بھی کرنی ہے جو صرف اپنی ''ڈیٹ آف برتھ'' کے بل بوتے پر سینئر بنے ہوئے ہیں اور ہمیں ڈراتے رہتے ہیں ایک بزرگ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے اور شکایت کی کہ ان کی بائیں ٹانگ میں درد رہتا ہے ڈاکٹر نے پوچھا آپ کی عمر کتنی ہے؟ بزرگ نے کہا ''اسی برس'' ڈاکٹر نے کہا تو پھر گھبرانے کی کوئی بات نہیں کیوں کہ اس عمر میں اس طرح کی تکلیفیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ چنانچہ اگر اسی برس کی عمر میں آپ کی ایک ٹانگ میں درد رہتا ہے تو آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے''۔ یہ سن کر بزرگ نے کہا: ''جناب! یہ تو ٹھیک ہے مگر میری دوسری ٹانگ بھی تو آخر اسی برس کی ہے، اس میں درد کیوں نہیں ہوتا؟ یہ تو بہت منطقی سوال ہے، اس کا جواب کچھ بزرگوں کی طرف سے ہم جونیئر لکھنے والوں کو ضرور ملنا چاہیے۔

جاپان میں مقیم جدید لہجے کے خوبصورت شاعر
ارژنگ کے مدیرِ اعلیٰ عامر بن علی کی کتب
① سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
② چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
③ محبت چھوگئی دل کو (شعری مجموعہ)
④ محبت کے دو رنگ (تراجم)
کے تازہ ایڈیشن دیدہ زیب اشاعت کے ساتھ مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔

ناشر
نستعلیق پبلی کیشنز
F-3 الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

معروف شاعر، سفرنامہ نگار
اورارژنگ کے مدیر
حسن عباسی کی کتب
① ہم نے بھی محبت کی ہے (شعری مجموعہ)
② ایک محبت کافی ہے (شعری مجموعہ)
③ اِک شام تمہارے جیسی ہو (شعری مجموعہ)
④ محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (سفرنامہ)
⑤ ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (سفرنامہ)
کے نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگئے ہیں۔

ناشر
نستعلیق پبلی کیشنز
F-3 الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

غالب کی شوخیاں

جمیل یوسف

شاعری میں، اور اس میں اُردو شاعری کی قید کیا ضرور ہے۔ جہاں غالب کے فکر کی بلندی اور اس کے خیال کی پیچیدگی کا کوئی جواب نہیں، وہاں اس کے اندازِ بیان کی شوخی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ غالباً اسی لیے اس نے اپنے بارے میں کہا ہے اور یہاں بھی اُس کی شوخی ملاحظہ ہو۔ اس نے دوسروں کا حوالہ دے کر اپنی تعریف کی ہے:

"کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور"

غالب کی اس شوخی میں بظاہر کہیں طنز اور کہیں مزاح کا رنگ جھلکتا ہے مگر بنیادی طور پر یہ شوخی، طنز و مزاح سے الگ اور منفرد شے ہے۔ طنز و مزاح کا موضوع تو عموماً روزمرہ زندگی کی کوئی ایسی صورت حال ہوتی ہے جسے بدلنا اور جس کی اصلاح کرنا مقصود ہو مگر غالب کی شوخی تو حقیقت حال سے محض لطف اندوز ہونے کے لیے ہے۔ اس میں دور دور تک حقیقت حال یا صورت واقعہ میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی کوئی آرزو نظر نہیں آتی۔ شاید اس کی وجہ تاریخ کا وہ جبر ہو جس کا سامنا غالب کو تھا اور جس کے زیر اثر غالب نے انگریز افسر کے سامنے کہہ دیا تھا کہ "میں آدھا مسلمان ہوں" یہ غالب کی وسعت نظری اور اس کی شخصیت کی عظمت تھی کہ تاریخ کے اس بے رحم جبر پر ایک بے پروا خندہ استہزا کی سکت اور جرأت اس میں موجود تھی اور اسی نے اظہار و بیان میں بعض اوقات شوخی کی شکل اختیار کر لی۔ اگرچہ پس منظر میں ایک طرح کی بے بسی اور غم و اندوہ کی کیفیت اپنی جگہ بہر حال موجود ہے۔ دیوان غالب کی پہلی غزل کا شعر ہے:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

عنقا ایک خیالی پرندہ ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ بھلا ایسے پرندے کو جال میں کیسے پھنسایا جا سکتا ہے۔ حقائق کی تلخی اور سنگینی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شاعر اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے خواب و خیال کی دُنیا میں پناہ لیتا ہے۔ ظاہر ہے خیال و خواب کا وجود نہیں ہوتا۔ آگہی اس خیال و خواب کو سننے اور سمجھنے کی جتنی بھی کوشش کرے، ناکام رہے گی۔ آگہی کی یہ کوشش ایسی ہی ہے جیسے جال بچھا کر کسی فرضی پرندے کو پکڑنے کی کوشش کی جائے۔

بظاہر تو یہ شعر ان لوگوں کے جواب میں کہا گیا ہے جو غالب کی مشکل پسندی اور گہری مضمون آفرینی کی وجہ سے اس کے اشعار کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے تھے اور حریفانہ چشمک کے طور پر غالب کے اشعار کو بے معنی بتاتے تھے مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنے حریفوں کو مخاطب نہیں کر رہا۔ وہ کہہ رہا ہے کہ میرے عالم تقریر کا مدعا ہی عنقا ہے بھلا سننے والوں کے ہاتھ کیسے آ سکتا ہے۔ اس میں آگہی کا قصور نہیں، ہمارا مدعا ہی ایسا ہے۔ آگہی کے لفظ سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے غالب نے یہ شعر مخالفین کے اعتراض کے جواب میں نہیں بلکہ محض اپنے مدعا کی نارسائی اور نایابی بیان کرنے کے لیے کہا ہے۔ غالب اور اپنے حریفوں کو آگہی کا تمغہ عطا کرے، ممکن نہیں۔ جن کے پلے اس کے اشعار نہیں پڑ رہے تھے انہیں غالب آگاہ کب گردانتا تھا:

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالب کی شوخی ملاحظہ ہو۔ لاش کے بے کفن ہونے کو بے چارگی اور کسمپرسی کے بجائے کس طرح خوبی کے طور پر بیان کیا ہے۔ بے کفن ہونا گویا آزادہ روی اور بے نیازی کی دلیل ہے۔ غالب کے اشعار میں جا بجا اس طرح کی خرابی کو خوبی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

زاہد جنت کے جس باغ کی اس قدر تعریف کر رہا ہے وہ ہم جیسے بے خودوں کے نزدیک ایک ایسا گلدستہ ہے جسے ہم طاق پر رکھ کر بھول چکے ہیں۔ گویا آدم کا جنت کو خیر آباد کہنا گلدستہ کسی جگہ رکھ کر بھول جانے کے مترادف ہے۔ یعنی ہمارے نزدیک اس کی اتنی اہمیت بھی نہیں کہ اسے یاد رکھیں۔ یہ وہی شوخی ہے جس کا اظہار غالب نے اپنے ایک اور شعر میں اس طرح کیا ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اگلی غزل کا ایک شعر ہے:

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

غالب کے اس شعر کو بھی اس کی شوخی طبع پر ہی محمول کیا جائے گا۔ آخر وہ کیسا محبوب ہے جس کے پری پیکر کو تو غالب سمجھتا ہے مگر اس کی باتیں نہیں سمجھتا۔ خود وہ پری پیکر غالب سے کھلا مگر اس کا بھید غالب پر نہیں کھلا۔ کیا وہ کوئی انگریز حسینہ ہے جس کی غالب سے ملاقات کلکتہ میں ہوئی اور اس کی یاد میں غالب نے یہ شعر بھی کہا:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اب اس غزل کا اگلا شعر دیکھیں:

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

در پہ رہنے کو غالباً اس لیے کہا ہوگا کہ بے چارہ بے سروسامان ہے۔ یہاں بیٹھا رہے گا اور مفت کی دربانی کرے گا مگر جب غالب اپنا لپٹا ہوا بستر کھول کر بچھانے لگا تو محبوب کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ دربانی کرنے کی بجائے یہ تو مزے سے محو استراحت ہونا چاہتا ہے۔ یہاں مستقل رہائش کا پروگرام بنا کر آیا ہے۔ اس نے فوراً اپنی پیش کش واپس لے لی۔ دراصل قسمت نے جو کھیل غالب کے ساتھ کھیلے اور تقدیر نے جو مذاق کیے یہ ان کا بیان ہے:

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

صورت حال ملاحظہ ہو۔ سیلاب کی آمد پر دل پھولے نہیں سما رہا۔ خوشی سے بلیوں اُچھل رہا ہے۔ عاشق کا مکان ایک ایسے ساز کا کام دے رہا ہے جو صدائے آب پر خوشی سے بج اُٹھا ہے۔ پانی کے شور یعنی جلترنگ کا ہم نوا بن گیا ہے۔ سیلاب سے جو در و دیوار ہلنے لگے ہیں یہ گویا خانۂ عشق سیلاب کی آمد پر سر دھن رہا ہے۔ سیلاب ایک ایسا محبوب ہے جس کے قدم رنجہ فرمانے پر گھر میں ہر طرف مسرت و شادمانی رقص کناں ہے:

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کا کہنا ہے کہ کوئی بھی کام ہو اور کسی نوعیت کا بھی ہو اس کا آسان ہونا بہت مشکل ہے۔ بسکہ دشوار یعنی بہت زیادہ دشوار اس بات کی جو دلیل دی ہے اس کی شوخی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں آدمی جس کی تخلیق ہی انسانی فطرت پر ہوئی ہے یعنی جسے انسان بنا کر بھیجا گیا ہے اور جس کا انسان بننا بہت ہی آسان کام ہونا چاہیے تھا۔ اسے بھی انسان ہونا میسر نہیں۔ یہاں میسر کے الفاظ کا استعمال بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لفظوں کے استعمال میں یہ غالب کی بے مثال اور بے پناہ استادی کا ثبوت ہے۔ میسر کے لفظی معنی ہیں ''آسان کیا گیا''۔ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ بے چارے آدمی کی بدقسمتی دیکھیں کہ اس کے لیے انسان ہونا بھی آسان نہیں کیا گیا۔ وہ بغیر کوشش اور تزکیہ نفس کے انسانیت کے مرتبے اور مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی عملی طور پر ایک عام آدمی عموماً حیوانی سطح پر ہی زندگی گزارتا ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

توبہ کرنا ایک نیک عمل ہے۔ توبہ گناہوں کو دھو ڈالتی ہے۔ میرے قتل کے بعد اس نے گناہوں سے توبہ کر لی یعنی اب وہ آئندہ کسی پر جور و ستم نہیں کرے گا۔ محبوب کتنا نیک سیرت ہے۔ گناہ پر فوراً پشیمان ہو گیا ہے۔ پہلے مصرع کے تیور اور زور بیان اور لفظ ''بعد'' سے مترشح ہے کہ محبوب کی جفا اور ستم رانی کا مقصد صرف مجھے قتل کرنا تھا۔ اس مقصد کے پورا ہو جانے کے بعد اس نے جور و جفا سے توبہ کر لی۔ گویا اب باقی عاشقوں یعنی میرے رقیبوں کے لیے وہ سراپا مہر و وفا بن گیا ہے۔ رقیبوں کے راستے سے صرف مجھے ہٹانا مقصود تھا تاکہ بے کھٹکے ان کے ساتھ رنگ رلیاں منا سکے۔ پھر میرا محبوب اپنی غلطی پر کس قدر جلد پشیمان ہو جانے والا ہے۔ بنیادی طور پر کتنا نیک خو ہے۔

''ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا'' میں ایک طنز بھی ہے کہ میں تو قتل ہو چکا اب اس کے پشیماں ہونے کا کیا فائدہ۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

یہ شعر غالب کی شوخی بیان کی ایک نادر مثال ہے۔ تعریف اپنی کر رہا ہے اور ظاہر یہ کر رہا ہے جیسے محبوب کی تعریف ہو۔ محسوس کے حُسن اور اس کی خوبی کا ذکر کرتے ہوئے بھلا کسی شاعر نے یا خود غالب نے کسی اور جگہ عبارت کا لفظ استعمال کیا ہے؟ عبارت اور اشارت کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ غالب اپنی شاعری کی خوبیاں بیان کر رہا ہے۔ عبارت اور اشارت کے بعد اور ان الفاظ کے تسلسل میں ادا کا لفظ بھی ذہن کو خیال یا مضمون کی ادائیگی کی طرف لے جاتا ہے۔ میرے خیال میں شعر دراصل یوں تھا:

بلائے جاں ہے، غالب کی ہر اِک بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

غالب چونکہ اس کھلم کھلا اتنی بھرپور اور بے محابا خود ستائی کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے ''غالب کی ہر اِک بات'' کی جگہ ''اس کی ہر بات'' کر دیا۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ غالب نے اپنے محبوب کی باتوں یا اس کے اندازِ گفتگو کی کبھی تعریف نہیں کی بلکہ کہا ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اگلا شعر ہے:

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے، کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

''ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا'' سے تو مراد یہ ہونی چاہیے تھی کہ ہم میں ایسے کمالات اور خوبیاں ہیں جن کی مثال نہیں ملتی مگر یہاں بات ہی اُلٹی ہے جو قہر و غضب ہم پر ہوا کسی اور پر نہیں ہوا۔ کوئی اور اس قابل ہی نہ سمجھا گیا کہ اس پر اتنا قہر و غضب کیا جاتا۔ جب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ تو پھر ہمارا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ہم یکتائے روزگار ہیں۔ کوئی ہمارا ثانی نہیں۔ بجائے اس کے کہ غالب اپنی بدحالی پر افسوس کرے، فخر و مباہات کا پہلو ڈھونڈتا ہے اور صرف یہی پہلو مدنظر ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دروازے پہ دستک دینا اور باریابی کی اجازت کے لیے التجا کرنا ہم اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہم اتنے آزادہ منش اور اتنے خود بیں ہیں (Self- respecting) ہیں کہ اگر کعبے کے دروازے کو بند پایا تو اُلٹے پاؤں واپس آ گئے۔ دروازے پر دستک دینے اور اُسے بطور خاص اپنے لیے کھلوانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ جب ہمارے استقبال کو کھلا ہوا دروازہ پہلے سے ہی ہمارا منتظر نہیں ہے تو ہمیں بھی اندر جانا منظور نہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی لطف سے خالی نہیں ہے کہ غالب نے اپنی آزادہ روی اور خود بینی کے اظہار کے لیے کعبے کے دروازے کا حوالہ دیا ہے جس کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

''سب کو مقبول ہے'' یعنی سب نے قبول کر لیا ہے سب نے تسلیم کر لیا ہے اسی لیے کوئی آئینہ سیما بت تیرے سامنے نہیں آیا۔ تیرے مقابل نہیں ہوا۔ اگر تیرے مقابل آ جاتا تو اس کی پیشانی کے آئینے میں تیرا عکس جلوہ فگن ہو جاتا جس پر تیرے مدمقابل کا شبہ کیا جا سکتا۔ چونکہ کوئی ایسا بت تیرے سامنے آیا ہی نہیں، اس لیے تیری یکتائی مسلم ہے۔

غالب نے ''مقبول'' اور ''یکتائی'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں تاکہ سامع اور قاری کا ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف جائے۔ کوئی بت اللہ تعالیٰ کے مقابل کیسے آ سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا سامنا کیسے کر سکتا ہے اور پھر کسی بت کی پیشانی آئینے کی طرح بھلا کیسے ہو سکتی ہے۔ چونکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں اس

لیے اللہ تعالیٰ کی یکتائی مسلّم ہے۔ غالب اللہ کی یکتائی ثابت کرنے کے لیے کیا عجیب و غریب دلیل لایا ہے:

غالب کی شوخی دیکھیے کہ دوسرا مصرع "سامنے کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا" اس طرح کہا ہے جیسے کسی بت آئینہ سیما کا سامنے ہونا نہ صرف ممکن تھا بلکہ عام سی بات تھی چونکہ بتوں نے اللہ تعالیٰ کی یکتائی کا دعویٰ تسلیم کرلیا ہے اس لیے کوئی بت سامنے نہیں آیا جس کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ کا ثانی دیکھا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

جو نالہ لب تک نہ گیا وہ سینے کا داغ بن کر سینے میں ہی رہ گیا اور ننگ و عار کا باعث بنا اسی طرح جو قطرہ دریا میں مل کر دریا نہ بن سکا وہ زمین پر گرا اور خاک میں جذب ہو کر معدوم ہو گیا۔ اُسے خاک نے ہڑپ کر لیا۔ یہ انداز بیان غالب سے مخصوص ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہے کہ جو چیز اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے کمال یا اپنی انتہا کو نہ پہنچی وہ رستے میں ہی غارت ہوگئی۔ بقول غالب:

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام وہ اچھا ہے جس کا کہ مآل اچھا ہے

اب اسی غزل کا اگلا شعر:

ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

عشق کا واقعہ بیان کرنے کا یہ جو معیار غالب نے مقرر کیا ہے اس پر دیکھیں کون پورا اُترتا ہے۔ پہلا مصرع ذکر کرنے والے اور ذکر سننے والے یعنی دونوں پر لاگو ہوتا ہے۔ کہتا ہے اگر عشق کا ذکر کرنے والے اور عشق کا ذکر سننے والے کے ہر بن مو سے خون نہ ٹپکے تو سمجھو کہ یہ عشق کا قصہ ہی نہیں بلکہ داستان امیر حمزہ ہے یعنی ایسے ہی جھوٹی داستان ہے۔

یہ شرط بھلا کہاں پوری ہو سکتی ہے۔ گویا غالب کے نزدیک عشق کی جتنی وارداتیں اب تک بیان ہوئی ہیں سب محض قصے کہانیاں ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں پائی جاتی۔ کوئی عشق کے مقام تک پہنچا ہی نہیں۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

یعنی آپ اگر قطرے میں دریا اور جزو میں کل کا مشاہدہ کرنے پر قادر نہیں ہیں تو اپنے آپ کو بینا نہ سمجھیں۔ جسے آپ دیدۂ بینا سمجھ رہے ہیں وہ تو ناسمجھ اور بے عقل لڑکوں کا کھیل ہے۔ دیدۂ بینا تو وہی ہے جو سطح کے مشاہدے سے گہرائی تک پہنچ جائے۔ اہل بصیرت کی نگاہیں جزو میں کل کا منظر دیکھ لیتی ہیں۔ غالب کے نزدیک جو لوگ ان معنوں میں دیدۂ بینا نہیں رکھتے وہ محض طفل مکتب ہیں اور ایسے لوگ جس طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ محض لڑکوں کا کھیل ہے۔ قرآن حکیم میں بھی ارشاد ربانی ہے کہ جو لوگ علم اور شعور نہیں رکھتے وہ انسان نہیں ڈھور ڈنگر ہیں بلکہ ان سے بدتر۔ اسی لیے تو غالب نے کہا ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اب ایک اور شعر دیکھیں:

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

تمام شارحین نے اس شعر کی تشریح غلط کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے پہلے مصرع کے الفاظ پر غور ہی نہیں کیا۔ اگر محبوب اپنے چاہنے والے کے گھر آ رہا ہے تو یہ معاملہ تو راز و نیاز کا ہونا چاہیے تھا نہ کہ یہ کہ سارے محلے میں خبر گرم ہے۔ محبوب کا آنا تو اس طرح نہیں ہوتا۔ اس کے آنے کا انداز تو ولی دکنی نے بیان کیا ہے:

ولی اُس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آوے ہے جوں سینے میں راز آوے

یہ شعر محبوب کی آمد کے بارے میں ہے ہی نہیں۔ غالب دراصل شراب کی بوتلوں کا انتظار کر رہا ہے اور اُسے یہ فکر دامن گیر ہے کہ گھر میں کوئی بوری نہیں جس میں یہ بوتلیں ڈال کر رکھے گا۔ قافیے کی ضرورت کے پیش نظر بوری کو بوریا کر دیا ہے۔

آپ غور فرمائیں غالب جیسا نازک خیال اور نفیس مزاج عاشق جو محبوبہ کے بارے میں کہتا ہے کہ

موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی اور
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

بھلا اپنے محبوب کو بورے پر بٹھائے گا:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب کی شوخی ملاحظہ ہو۔ اپنی زندگی کو خدائی کہہ گیا ہے۔ جس طرح نمرود کی خدا بن کے اور خدائی کا دعویٰ کر کے کچھ فائدہ نہیں ہوا دنیا اُسے ایک ظالم اور کافر بادشاہ کے طور پر جانتی ہے جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈلوا دیا تھا۔ شاعر کہتا ہے جس طرح نمرود کو اپنی خدائی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اسی طرح مجھے اپنی بندگی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیا میری بندگی بھی نمرود کی خدائی تھی؟

غالب کے اس شعر سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ جو بندگی ریاکاری پر مبنی ہو اور متکبر بنا دے وہ بندگی نہیں بلکہ نمرود کی خدائی ہے۔ اس سے کسی بھلائی کی اُمید نہیں:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہر مذہب میں اللہ کی راہ میں کسی بلند مقصد کے لیے جان دینا سب سے بڑی نیکی سمجھی جاتی ہے مگر غالب نے اس موضوع پر اپنے اس شعر میں ایک انوکھا مضمون پیدا کر دیا ہے۔ کہتا ہے جان دینا بھلا کون سی نیکی ہے اگر اللہ کی راہ میں جان دی ہے تو کون سا کمال کر دیا ہے۔ جان تو اللہ کی ہی دی ہوئی تھی۔ ہم نے واپس لوٹا دی۔ اُسی کی چیز تھی اُسی کو لوٹا دی۔ زندگی کو حیات مستعار کہتے ہیں یعنی مانگی ہوئی شے۔ مانگی ہوئی شے دینے والے کو واپس کر دی۔ اپنے پاس سے تو ہم نے کچھ نہیں دیا اسی لیے دوسرے مصرعے میں غالب کہتا ہے "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" یعنی سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ نے زندگی کی جو نعمت ہمیں عطا کی تھی محض جان دے کر اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جان قربان کر کے حق ادا نہیں ہوتا۔ بلکہ زندہ رہ کر اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر دوسرے انسانوں کے کام آ کر اور انسانیت کی خدمت کر کے زندگی کی نعمت کا حق ادا ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے:

''موت مشکل زندگی مشکل تر است''

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا روا نہ ہوا

غالب کہتا ہے کہ جس چیز میں میرا نقصان ہو وہ ہو جاتی ہے اور جس چیز میں فائدہ ہو وہ نہیں ہو پاتی۔ بس یہی ایک قاعدہ کلیہ ہے جس کے مطابق میرے حالات مشکل سے مشکل تر ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کے عام آزمودہ قاعدے کلیے میرے معاملات میں کام نہیں کرتے۔ مثلاً اگر میرے زخم کو دبا دیا جائے تو لہو نہیں تھمتا۔ عام مشاہدہ ہے کہ اگر زخم پر اُنگلی رکھ کر ذرا سا دبایا جائے تو زخم سے خون رسنا بند ہو جاتا ہے مگر غالب کہتا ہے کہ میرا زخم دبنے سے بھی لہو نہیں تھمتا اور پھر شوخی سے کہتا ہے کہ اگر میں اپنے لیے اسی کو قاعدہ کلیہ سمجھ لوں کہ میرے معاملات میں رُکاوٹ اثر نہیں کرے گی اگر میرا کوئی کام رُک گیا تو خود بخود چل پڑے گا۔ رُکے گا نہیں۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ وہ زخم والا فارمولا یہاں لاگو نہیں ہوتا۔ میرا حال کسی معقول قاعدے کلیے میں نہیں آتا۔ بس یہی قاعدہ کلیہ نظر آتا ہے کہ جو بات میرے حق میں بری یا نقصان دہ ہو وہ واقع ہو جاتی ہے۔

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل، داستاں روانہ ہوا

یہ کسی راہ چلتے محبوب کا ذکر ہے کسی ایسے حسین کا جس کے حسن و جمال کی تاب نہ لا کر دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی دل دے بیٹھا ہے۔ وہ حسین تو ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر اور عاشق کا دل لے کر آگے بڑھ گیا مگر Love at first sight کا شکار ہو جانے والا عاشق تو وہیں حیران و پریشان کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ کوئی دلستانی ہے یعنی یہ کوئی دل لینے کا طریقہ ہے یہ تو رہزنی ہے ڈاکہ ہے۔ دل لے کے چلتا بنا ہے۔ پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ حالانکہ ہوسکتا ہے اس حسین کو عاشق کے لٹ جانے کی خبر ہی نہ ہو۔ فیض کا شعر یاد آ گیا:

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والے
کوئی کم بخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

غالب کی اگلی غزل ہے:

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

پہلے مصرع میں ''بھی'' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ دل اپنی وسعت میں دریا سے بڑھ کر ہے ''دل دریا سمندروں ڈونگھے'' حیرت ہے کہ ہمارا شوق اپنے اضطراب میں دل کے اندر سما نہیں رہا۔ اُسے تنگیٔ جا کا گلہ ہے حالانکہ دریا کا اضطراب موتی جیسی چھوٹی سی چیز میں سما گیا ہے محو ہو گیا ہے یعنی دریا کے اضطراب کو گہر میں سمٹ کر سکون میسر آ گیا ہے اور وہاں گوشہ نشین ہو کر آب و تاب سے چمک رہا ہے مگر میرے شوق کو میرے دل میں سکون نہیں ملا اور وہ اپنے بے پناہ اضطراب میں میرے دل کو بھی مضطرب کیے ہوئے ہے۔ غالب کو اپنے دل کے مقابلے میں گہر پر رشک آ رہا ہے۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں شوقِ خامہ فرسا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو خط کا جواب نہیں دے گا ''تو اور پاسخ مکتوب'' میں جو زورِ بیان ہے اس کا جواب نہیں۔ یعنی تو اور میرے خط کا جواب دے، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ مگر میں ہوں کہ خط پر خط لکھے جا رہا ہوں کیا کروں اپنا قلم گھسانے یعنی لکھنے کے شوق کا ستم زدہ ہوں یعنی مجبور ہوں۔

غالب کی شوخی ملاحظہ ہو یہ نہیں کہتا کہ محبوب کی محبت سے مجبور ہو کر اُسے خط لکھ رہا ہوں کہتا ہے لکھنے کا شوق ہے جس سے مجبور ہو کر لکھ رہا ہوں تیری محبت کا ستم نہیں اپنے شوق کا ستم ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دُنیا کا

یہ شعر غالب کی نکتہ آفرینیوں کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ بہار کی رعنائیوں اور رنگینیوں سے مطمئن نہیں ہے۔ اسی لیے کہا ہے ''بہار اگر ہے یہی'' اس گئی گزری بہار کی رنگینی تو ایسے ہی ہے جیسے خزاں کے پاؤں پر مہندی لگی ہو۔ گویا یہ بہار حقیقت میں بہار نہیں ہے یہ تو خزاں ہے جو پاؤں پر مہندی لگا کر آ گئی ہے تاکہ ہمیں بہار کا گماں ہو۔ دوسرے مصرعے میں کہتا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ دُنیا کا عیش تو نظر کا دھوکہ اور فریب ہے۔ ہمیشہ رہنے والی چیز کلفت خاطر ہی ہے یعنی دل کا ملال اور پریشانی۔

خود غالب نے اپنی زندگی اور زوال اور انتشار کے جس عہد میں وہ رہ رہا تھا اس کی حقیقت بیان کی ہے:

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

جب محبوب کی جدائی میں دل اُداس و دُکھی ہو تو کوئی چیز اچھی نہیں لگتی اور کسی چیز سے جی نہیں بہلتا۔ بلکہ اچھی چیزیں بھی بری لگتی ہیں۔ کہتا ہے مجھے باغ میں مت لے جاؤ میں اس موڈ میں نہیں ہوں کہ پھولوں کی مسکراہٹ سے لطف اُٹھا سکوں۔ ان کی مسکراہٹ مجھے ایسی لگتی ہے جیسے وہ خواہ مخواہ مجھ پر ہنس رہے ہیں اور میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے خندہ ہائے بے جا اس لیے بھی کہا ہے کیونکہ پھول بغیر سوچے سمجھے بس ہنستے چلے جاتے ہیں۔ دیکھنے والے کی حالت کا خیال نہیں کرتے:

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

یہ غالب کے خوبصورت ترین اور لازوال شعروں میں سے ایک ہے۔ حمد کا شعر ہے کہتا ہے کہ میرے جسم کا ہر بن مو چشم بینا کا کام کر رہا ہے مگر حسن اتنا بے پناہ اور بیکراں ہے کہ میں اس کو دیکھنے اس کا احاطہ کرنے اور اس کو سمجھنے کے لیے ترس رہا ہوں۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

''حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں''

غالب تو ہزاروں بلکہ لاکھوں آنکھوں سے اس کا جلوہ دیکھنے میں محو ہے پھر آنکھیں بھی وہ آنکھیں نہیں جنہیں عام آنکھیں کہا جائے۔ ان بے شمار آنکھوں میں سے ہر آنکھ چشم بینا ہے۔ مگر پھر بھی وہ حسن کی محرمی یعنی شناسائی کو ترس رہا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اگر دُنیا کے سارے درخت قلم بن جائیں اور سارے سمندر روشنائی میں بدل جائیں پھر بھی صانع قدرت کی تعریف و توصیف قلمبند کرنے سے قاصر رہیں گے۔

غالب کی شوخیاں ان چند اشعار سے ظاہر ہیں۔ اس کی شوخیوں سے تو اس کا سارا دیوان بھرا پڑا ہے مگر اس کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے۔

عامر بن علی کی کتاب ''محبت کے دو رنگ''

امتیاز علی اسدؔ

چیف ایڈیٹر ''شب و روز''

عامر بن علی سے اوّل و آخر تعارف و ملاقات کا حوالہ طاہر نسیم ہے اور اُنہی کے ساتھ تقریباً 8-10 برس قبل عامر بن علی سے ملنے میاں چنوں گیا تھا۔ تب قمر رضا بھی ہمراہ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم اُن کے محل نما گھر میں داخل ہوئے تو دیو قامت مسلح محافظوں نے مہمان خانہ تک رہنمائی کی تھی لیکن جب دروازہ کھلا تو سامنے دھان پان وجود کی جس خوش لباس شخصیت نے دمکتے مسکراتے چہرے اور مترنم آواز کے ساتھ بغل گیر ہوکر ہمارا استقبال کیا تھا وہ عامر بن علی تھے اور اُس لمحے مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب وہاں موجود خدام کی جماعت کے باوجود عامر بن علی نے ہم مہمانوں کی خندہ پیشانی سے تواضع کی اور بالخصوص میری جانب سے مسلسل سمع خراشی کو کمال مسکراہٹ سے شرفِ قبولیت عطا کرتا ہوا عالمی شہرت کا وہ نوجوان شاعر، دانشور، ادیب اور مترجم سمندر صفت سامع کی طرح نہ صرف سنتا رہا بلکہ عجز کا وہ پیکر سعادت مندی کی ایسی تصویر بنا کہ اُس کے بعد میں اپنے بچوں کو اُنہی کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اُس پہلی ملاقات میں عامر بن علی نے اپنا شعری مجموعہ ''محبت چھوٹی دل کو'' پیش کیا جسے پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ عامر بن علی میرا ہی نہیں ہر محبت کرنے والے کا ترجمان شاعر ہے۔ عامر بن علی اپنے کلام میں جس معصومیت، سادگی اور بے ساختگی سے کومل الفاظ کو محبت کی مالا میں پروتا ہے اُس کی مثال اُن کے ہم عصر شاعروں میں کم ہی ملتی ہے۔ اُن کا تخلیقی حسن اور شعری نغمگی کو اُن کی نظموں میں بالخصوص تلاش کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ نسلِ نو کا نمائندہ شاعر ہے۔

خواتین و حضرات! پھر عامر بن علی سے سال بھر میں دو تین ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہ جب جب جاپان سے پاکستان آتے میں طاہر نسیم کے ہمراہ اُنہیں ملنے میاں چنوں جانے کو سعادت شمار کرتا اور وہ ہر بار اپنی کتب سے نوازتے۔ یوں اُن کے مجموعہ ہائے کلام ''چلو اقرار کرتے ہیں''، ''سرگوشیاں''، ''یاد نہ آئے کوئی'' کی صورت بیش قیمت تحائف نے عامر بن علی کی شخصیت، دلچسپیوں، معاشقوں، اُن کی کامیابی و ناکامیوں، صادق جذبات، نرم و گداز احساسات اور مدھر و مترنم خیالات کو آشکار کیا۔ اوّل اوّل میں اُنہیں سخن ور اور سخن شناس تک ہی جانتا تھا لیکن ایبٹ آباد سے آئے ہمارے مہمانوں کی تاج محل میں میزبانی کے اچھوتے انداز نے اُنہیں بحیثیت سخن نواز متعارف کروایا۔

خواتین و حضرات!

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

جیسے شہرہ آفاق شعر سے آسمانِ ادب پر مہتاب کی طرح چمکنے والا عامر بن علی ہمارے دلوں میں گھر کر چکا ہے اور مجھے اُن کی مدحت پر ناز ہے۔

خواتین و حضرات! احساس لوگوں کا المیہ ہے کہ وہ آزمائش میں مبتلا رہتے ہیں یا پھر آزمائش اُنہیں حساس بنا دیتی ہے۔ اِسے اس زاویے سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ حساس لوگ غم و آلام، حسرت و یاس اور مسرت و انبساط کو بہت قریب سے بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں اور پھر جب ان احساسات کو الفاظ کی مالا میں پرو کر شعری سخن میں ڈھالتے ہیں تو دلوں پر راج کرنے والے شاعر بن جاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک محبت شبنم کی طرح شفاف، پاک اور پوتر ہوتی ہے، ناجائز نہیں ہوتی۔ عامر بن علی اسی قبیل کا سربلند فرزند ہے۔ عامر بن علی اپنے منفرد اسلوب، اندازِ تکلم اور فکر و آہنگ کے حوالے سے بلاشبہ منفرد خوش نوا شاعر ہے لیکن بحیثیت مترجم لاطینی امریکہ کے ملک چلی کے شہرہ آفاق شعراء گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کے منظوم کلام کی روح کو سلامت رکھتے ہوئے اُن کا جس مہارت و منفرد انداز میں ترجمہ کیا ہے، اُس کی ستائش کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ عامر بن علی اپنی نئی کتاب ''محبت کے دو رنگ'' کے تعارف میں خود لکھتے ہیں'' ویسے تو شاعری کا ترجمہ جتنا بھی خوبصورت ہو، اُس میں اصل زبان والی چاشنی اور موسیقیت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ایسی ہی ہے جیسے کسی خوبصورت منظر کی تصویر کشی کی جائے اور پھر اُس تصویر سے تصویر بنائی جائے۔''

خواتین و حضرات! پندرہ برس کے فرق سے 19ویں کے آخری اور 20ویں صدی کے پہلے عشرے کے ان دو شعراء کا کلام عامر بن علی کی زبان میں پڑھنے کے بعد پہلی بار عقدہ کھلا ہے کہ مرد عورت سے اور عورت مرد سے کیسی محبت کرتی اور کیسے چاہتی ہے۔ گبریلا مسترال نے مرد سے محبت اور پابلو نرودا نے عورت سے محبت کے جذبوں کو لفظوں کی زبان دی ہے۔ جس کی جھلکیاں ان دو نظموں کی صورت میں پیش کرکے اجازت چاہتا ہوں۔

گبریلا مسترال اپنی نظم ''میں تنہا تو نہیں ہوں'' میں لکھتی ہیں:

رات! یہ تو ویران ہے
پربتوں سے لے کر سمندروں تک
لیکن میں! جو کہ تمہاری کوہ پیا ہوں
میں تو تنہا نہیں ہوں

آسمان! یہ تو ویران ہے
کیونکہ چاند تو سمندر میں ڈوب گیا ہے
لیکن میں! وہ ہوں جو تمہیں تھامے ہوئے ہوں
میں تنہا نہیں ہوں

دُنیا! یہ تو ویران ہے
جسم کا سارا گوشت دُکھی ہے تم دیکھ سکتے ہو
لیکن میں! جو تمہیں بانہوں میں سمیٹے ہوئے ہوں
میں تو تنہا نہیں ہوں

پابلو نرودا اپنی نظم ''رانی'' میں لکھتے ہیں:

میں نے تمہارا نام رانی رکھ دیا ہے
تم سے بھی زیادہ طویل القامت جہان میں ہیں
زیادہ لمبی
جہاں میں تم سے بھی زیادہ خالص ہیں
زیادہ مخلص
دنیا میں تم سے بھی زیادہ حسین ہیں
حسین تر حسینائیں
مگر تم ملکہ ہو
جب تم گلی کوچوں میں سے گزرتی ہو
تو تمہیں کوئی بھی نہیں پہچانتا
کسی کو بھی تمہارا ابلوریں تاج نظر نہیں آتا
کوئی نہیں دیکھتا
سرخ سونے کے قالین کو کوئی نہیں تکتا
جو تمہاری راہوں پہ بچھتا ہے جب تم گزرتی ہو
نظر نہ آنے والا قالین
اور جب تم جلوہ گر ہوتی ہو
تمام دریا گنگنانے لگتے ہیں
میرے جسم میں گھنٹیاں بجتی ہیں
گھنٹیوں کی آواز عرش ہلا دیتی ہے
اور بھجن کی آواز سے دنیا بھر جاتی ہے
صرف تم اور میں
صرف تم اور میں، میری محبوب
میری بات پر دھیان دو

حسن عباسی کا سفرنامہ بھارت

امجد علی شاکر

حضرت آدم کو جنت سے اِذنِ سفر کیا ملا، ان کی اولاد کے قدم کہیں ٹکتے نہیں۔ اولادِ آدم مسلسل سفر میں ہے۔ سفر سفر تو ہوتا ہے مگر کبھی کبھی ''وسیلۂ'' سفر بھی بن جاتا ہے، ویسے سفر میں سو طرح کے قصے ہوتے ہیں۔ عزیز حامد مدنی نے کہا تھا:

طلسم خوابِ زُلیخا و دام بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

حسن عباسی کا سفرنامہ ''محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو'' پڑھ کر یہ شعر بار بار یاد آیا۔ اُردو کا قاری مستنصر حسین تارڑ کو پڑھ کر یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ سفرنامہ نگار کو ہر منزل پر ایک حسینہ ماہ جبینہ سے ضرور واسطہ پڑتا ہے جسے نقد دل دے کر سفرنامہ نگار اپنے سفر کو وسیلہ ظفر اور منزل کو شاید باد منزلِ مراد بنا لیتا ہے۔ حسن عباسی کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اُسے ہر منزل پر ایک نہیں کئی حسیناؤں سے واسطہ پڑا، جنھیں نقد دل پیش کرنے کے لیے دل کو سی پارہ کرنا پڑتا تھا یا دل کی ریزگاری لینا پڑتی تھی۔ ایسا بھی نہیں کہ حسن عباسی سفر میں جمعرات کے فقیروں کی طرح حسیناؤں کو دل کا ایک ٹکڑا پیش کر کے آگے بڑھتا رہا اور آخر میں بعض حسیناؤں کو معاف کرو کہہ کر جان چھڑاتا رہا۔ حسن عباسی شاعر تو ہے مگر ذہین نوجوان ہے، اُوپر سے عطاء الحق کی صحبت سے فیضیاب بھی ہے۔ وہ حسیناؤں کے جھرمٹ میں انتخاب کا قائل رہا ہے۔ وہ صرف منتخب حسیناؤں کو اہمیت دیتا اور باقی ماندہ کو مسکراہٹ پر ٹالتا رہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُس کے سفر میں سب اچھا کا معاملہ تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ وہ کسی حسینہ کی زُلف میں بندھا اُس کی توجہ کا منتظر رہا اور وہ ایک سات ماہ کی بچی کے پیچھے خوار ہوتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ بچی کے باپ کا ہاتھ تھامتی مگر بچی کی ماں کی موجودگی خطرہ 440 وولٹ بنی ہوئی تھی۔ بیچاری محبت کی ماری باپ کی بجائے بیٹی کے پیچھے بھاگتی رہی۔ محبت میں کیا کیا سخت مقام آتے ہیں:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

حسن عباسی دوبار ہندوستان گیا۔ دونوں بار کسی نہ کسی وفد کے ساتھ گیا۔ ہر بار اُسے کئی کئی خواتین کا ساتھ نصیب ہوا۔ وہ دل کے نہاں خانوں اور ڈیجیٹل کیمرے میں ان کی تصویریں لیے واپس آیا۔ کچھ عرصہ تو صبر کیا، آخرکار دل اور ڈیجیٹل کیمرے سے نکال کر یہ تصویریں صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیں، یوں ایک سفرنامہ وجود میں آیا۔ ایسا سفرنامہ جس کے سامنے مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کا رنگ بھی ہلکا ہے۔ تصویر کائنات میں وجودِ زن سے ہی رنگ اور روشنی ہے، سو اس سفرنامے میں رنگوں کی بہار دکھائی دیتی ہے یا روشنیوں کا سیلاب اُمڈا ہوا ہے تو اس کی وجہ ان مہ جبینوں کا وجود ہے جو ان سفرناموں میں چارسو بکھرا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں ہندوستان سے متعلق ایک رویہ ہمارے محترم جناب مجید نظامی کا ہے جو صرف ٹینکوں پر بیٹھ کر ہی ہندوستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حسن عباسی نے ایسا کوئی تکلف نہیں کیا، اسی لیے وہ جوانی میں ہی ہندوستان کے دو سفر کر آیا ہے، ورنہ یہ موقع شاید بڑھاپے میں بھی نصیب نہ ہوتا۔ ہندوستان سے ہمارا معاملہ بھی عجیب ہے۔ ۱۹۴۷ء میں زمین تقسیم ہوئی اور دو ملک وجود میں آ گئے، پاکستان اور ہندوستان۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں زمانے بھی تقسیم کر لینے چاہئیں۔ زمین کی تقسیم کی ذمہ داری ریڈکلف پر ڈالی گئی۔ اُس نے جو تقسیم کی اُس میں سو گھپلے نظر آتے ہیں۔ زمانوں کی تقسیم ایک اخبار، ایک جماعت اور نوابزادہ شیر علی قسم کے لوگوں نے سنبھال لی۔ اس میں بھی بہت گھپلے ہوئے ہیں۔ پھر زمانے تقسیم بھی کر لیں تو ہم علی گڑھ دیوبند جامعہ ملیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی، حضرت معین الدین سجزی قدس سرہ العزیز کا اجمیر، حضرت نظام الدینؒ کی بستی کو اپنی تاریخ سے خارج نہیں کر سکتے۔ یہ ساری بستیاں اُس دیس میں بستی ہیں جو ہمارے پڑوسیوں کا دیس ہے۔ جسے ہمارے دشمن کا دیس بھی کہا جاتا ہے۔

حسن عباسی دو دفعہ ہندوستان گئے۔ پہلی بار آگرہ تک ہو آئے، دوسری بار اُڑیسہ تک۔ پہلی بار جب وہ گئے تو تاج محل دیکھنے کا خواب لے کر گئے تھے۔ تاج محل جو بچپن میں ہی ان کے خوابوں میں بستا تھا۔ اُس نے بچپن میں تاج محل کا تذکرہ سنا اور اس کے حُسن سے مسحور ہو گیا۔ یہ بھی سنا کہ وہ انڈیا میں ہے۔ وہ تاج محل دیکھنے کے خواب بنتا رہا۔ آخر ایک روز سارک کی دعوت میں ہندوستان پہنچا تو اُسے تاج محل دیکھنا نصیب ہوا۔ لاہور سے تاج محل اور پھر واپسی کے سفر میں طلسم دامِ زُلیخا بھی آئے اور تاج محل پہنچ کر دامِ بردہ فروش بھی۔ طلسم دامِ زلیخا نے اُسے گھر کی یاد بھلا دی۔ اس میں گھر والی کی محبت بھی شامل تھی اور بڑے گھر یعنی وطن کی محبت بھی۔ دامِ بردہ فروش سے میزبانوں نے بچا لیا اور یوں وہ بخیر و عافیت گھر پہنچ گیا۔

دوسری بار وہ اڑیسہ تک ہو آیا اور بھگوان جگن ناتھ کے مندر کے دروازے کے باہر سے ہی لوٹ آیا۔ اس لیے کہ اُس کے مندر کے اندر جانے کے لیے زائر کا بھگوان کا پجاری ہونا بھی ضروری ہے اور اعلیٰ ذات کا پجاری بھی۔ اُسے یقیناً دین اسلام یاد آیا کہ یہ دین کافۃ للناس ہے۔ حسن عباسی کا یہ سفر خالی خولی احوالِ سفر نہیں ہے کہ اسے رپورٹر تو بننا نہیں ہے، وہ تو شاعر اور ادیب ہے اس لیے یہ سفرنامہ اس کا فن بھی ہے اور اُس کا فکر بھی۔ وہ اس سفر میں اجنبی منزلوں کا سفر بھی کرتا ہے اور اپنے ماضی کے سفرِ زندگی کا قصہ بھی کہتا ہے۔ وہ ایک وقت میں کئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے۔ یہی انسان کا مقدر ہے، یہی اس سفرنامے کا مقدر بھی ہے۔

حسن عباسی ہندوستان کے سفر تو کرتا ہے، مگر اپنا وطن نہیں بھولتا یعنی وہ بین الاقوامی ہونے کی کوئی ایسی کوشش نہیں کرتا جس سے مقامیت کی نفی ہو۔ ایک آدھ جملہ دیکھیے:

"انگریزوں کی تعمیر کردہ خوبصورت چیزوں کو نظر نہیں لگتی، ورنہ ہم تو جو کچھ تعمیر کرتے ہیں، نظر بد کی کالی کنی رکھنے کے باوجود ان کا وجود "اُدھڑتا" ہے۔ صفحہ: ۲۵

احوالِ وطن کے لیے کس قدر بلیغ جملے ہیں۔ یہ عمارتوں سے متعلق بھی ہیں، ہمارے اپنے بنائے ہوئے اداروں اور منصوبوں سے متعلق بھی ہیں۔ اپنی نوزائیدہ جمہوریت سے متعلق بھی جو بار بار نوزائیدہ ہوتی رہی ہے۔ اپنے آئین سے متعلق بھی یہ جملے خاصے بامعنی ٹھہرتے ہیں۔

حسن عباسی بچپن میں یا تو تاج محل کی خوبصورتی کا قصہ سنتا تھا یا اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی کا قصہ سنتا تھا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ شہر میں فوج آ گئی۔ اس کے سکول اسٹیشن، ہر طرف فوج کا قیام تھا۔ اسٹیشن کی طرف جانے والا راستہ بھی بند کر دیا گیا اور جو راستہ مروٹ کو جاتا تھا جہاں سے ہندوستان قریب تھا اور اُس سے آگے تاج محل تھا، وہ بھی بند تھا۔ آخر ایک روز فوج واپس چلی گئی، آگے کا حال حسن عباسی سے سنیے:

"پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ شہر میں کوئی فوجی نظر نہ آیا۔ میں تاج محل کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ پڑا۔ مجھے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میں اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر ننگے پاؤں دوڑتا گیا اور کوارٹر پر جا کر سانس لیا، مگر وہاں جا کر پتا چلا کہ تاج محل جیسی لڑکی اب وہاں نہیں۔" (صفحہ: ۲۸)

ان جملوں سے کچھ یوں احساس ہوتا ہے کہ وہ علامتی طور پر مارشل لاء کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی ہماری خوبصورت ریلوے ہے، جہاں سناٹا طاری ہے۔ خالی پٹڑی نظر آتی ہے اور ریلوے غائب ہے۔ ممکن ہے سچا واقعہ ہو، مگر علامتی مفہوم سے بھی انکار کرنا کیوں کر ممکن ہے۔

حسن عباسی نے اپنے سفرنامے میں بہت سی خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔ تذکرہ کرتے ہوئے وہ سراپا نگاری پر بھی توجہ کرتا ہے، اگرچہ مختصر لفظوں میں ہی خوبصورتی سے سراپا پیش کر دیتا ہے۔ وہ زیادہ تر رمز و ایما اور اشارہ و کنایہ سے کام لیتا ہے۔ ایک سراپا دیکھیے:

"اوزون خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ سرو قد بھی تھی اس لیے سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ پھر اس کے جسم کی تراش ایسی تھی کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہوں گے۔" (صفحہ: ۶۵)

حسن عباسی شاعر ہے، وہ سفرنامے میں شعر سنانے سے کبھی باز نہیں آیا، نہ کبھی نثر میں شعریت پیدا کرنے سے باز رہ سکا ہے۔ اب اُوپر والے جملے میں غالب کے شعر کا حُسن پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ دو جملے اور بھی دیکھ لیجیے۔ یہ بھی اوزون کے بارے میں ہیں۔ جملوں میں معنی اور معنویت سے لطف لیجیے:

"اوزون جتنی آسان تھی، ناگالینڈ کی بھاشا اتنی مشکل تھی۔ بہت کوشش کے باوجود میں صرف چند کلمات سیکھ پایا اور اب تو وہ بھی بھول چکا ہوں۔ صرف اوزون کی ہنسی یاد رہ گئی ہے۔" (صفحہ: ۶۵)

بات تو پہلے کہی جا چکی ہے کہ پہلے سفرنامے میں خواتین تعداد میں کافی زیادہ تھیں، اس لیے اندازِ بیاں محبت کے شیرے سے شرابور تھا، دوسرے سفرنامے میں لڑکیاں ذرا کم تھیں، اس لیے ہنسی مذاق کا موقع نکل آیا۔ ایک مختصر سا پیرگراف دیکھیے:

"وہ (بسرا) بہت خوش تھا اور اس نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ جب ٹرین روانہ ہوئی تو وہ بنگالن جو الاکھی اُسے زور زور سے آوازیں دیتی اور دوڑتی ہوئی آئی اور اُس کے گلے لگ گئی۔ دروغ برگردن راوی"

دروغ برگردن راوی کہہ کر اُس نے اس اصول کی لاج رکھ لی ہے کہ بندہ بے شک ضائع ہو جائے مگر فقرہ کبھی ضائع نہ ہو۔ حسن عباسی نے اپنی کتاب میں جب کبھی کسی مہ جبیں کا تذکرہ کیا ہے اور اکثر کیا ہے تو فقرے ضائع نہیں کیے ان کی نذر کیے ہیں اور جب کسی شخص کا ذکر آیا ہے تو بھی فقرہ ضائع نہیں کیا، بعض اوقات بندے ضائع کر دیے اور یہ کوئی غلط کام بھی نہیں تھا۔ بعض بندے ضائع کر دینے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔

حسن عباسی نے خالی خولی ان اللہ کے بندوں اور اللہ کی بندیوں کا تذکرہ نہیں کیا، جو اسے سفر میں ملے تھے، اس نے سفر میں انڈیا کا تاریخی جغرافیہ بھی دیکھا اور وہ زمانے بھی ڈھونڈ نکالے جو ہم وہاں چھوڑ آئے تھے۔ ان سب کا حال جاننے کے لیے یہ مضمون کافی نہیں ہوگا، اس کے لیے تو حسن عباسی کا سفرنامہ پڑھنا ہوگا۔

❀❀❀

عشق کا جب سوال کر دیا تھا
چشم کو برشگال کر دیا تھا
اُس پریتم نے دو گھڑی کے لیے
مجھ سے ملنے کو سال کر دیا تھا
خواب آنکھوں کو جو دیا اُس نے
اپنی خوشبو میں ڈھال کر دیا تھا
میں نے تنہائی میں پکارا تو
اُس نے یادوں کو شال کر دیا تھا
خود کو سانپوں میں پال کر یوں بھی
زندہ رہ کر کمال کر دیا تھا
داد دیتا وہ میری ہمت کو
زخم جو اندمال کر دیا تھا

میں جس کے حسن کو آنکھوں کا جام کرتا رہا
مرے عدو سے وہ مل کر کلام کرتا رہا
تمام عمر گزاری ہے نفرتوں میں مگر
دیارِ عشق میں پیدا مقام کرتا رہا
تمازتوں میں گزارا ہوا تھا دن میں نے
تمہاری زُلف کے سائے میں شام کرتا رہا
ترے خیال کی تصویر باندھنے کے لیے
میں شغل بادہ بصد اہتمام کرتا رہا
وہ شخص جس کو بناتے لگی تھی عمر میری
مگر وہ شخص میرا انصرام کرتا رہا
مقامِ شکر عداوت کی محفلوں میں رضاؔ
ضیاءِ سخن کی جو رکھتا تھا عام کرتا رہا
نعیم رضا بھٹی/منڈی بہاؤالدین

آہ! اُستاد پرنم الٰہ آبادیؒ

محمد اقبال پیام شجاع آبادی

عشق الٰہی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ماسا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں مگر انسان آب وگل کے تعلقات میں اس طرح پاگل ہے کہ جب تک دل پر درد کی محکم چوٹ نہ لگے وہ کبھی بھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ انسان کا دل جب تک چوٹ نہ کھائے دنیا کی لذتوں کو نہیں چھوڑتا۔ یہ چوٹ صرف عشق ہی کے ہاتھوں لگ سکتی ہے اسی طرح اُستاد حضرت پرنم الٰہ آبادیؒ عاشق رسولؐ اور عاشق اولیاء کرام کے پروانوں کے مزاج شناس تھے۔ آپ نے ساری زندگی اصولوں کے مطابق گزاری اور ہمیشہ حقیقی عشق کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ عشق رسولؐ ہی ان کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ انسان کو یہ بصیرت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ریاضت اور مجاہدہ کرتا رہا ہو اور ایک خاص امتیازی درجہ حاصل کر چکا ہو تا کہ عقل روشن ہو جائے اور ہر واقعہ اور ہر شے اپنی حقیقی شکل میں نظر آئے۔ خالق و مخلوق، عبد و معبود اور حق و باطل کے امتیازات اور تعلقات عشق و حُسن کی ماہیت و نوعیت، ترک و جستجو کی اصلیت کو صحیح طریقے سے سمجھنا صوفیانہ مسلک کا ایک اہم اصول ہے۔ ان تمام تر خوبیوں سے اللہ تعالیٰ نے اُستاد حضرت پرنم الٰہ آبادی کو نوازا۔ آپ نے اپنی زندگی میں وہ تمام باتیں اپنے کردار سے اور اپنے قول سے کھول کر رکھ دیں جو فقر کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ آپ نے درویشانہ اور فقیرانہ زندگی گزاری اور فقیر درویش کی زندگی تصوف کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ آپ ہمیشہ سچ کی تلاش میں رہے اور سچ کی خاطر اپنے دل کی آواز کو اپنے کلام سے عشق الٰہی، عشق محمدؐ اور عشق اولیاء کرام کے بارے میں وہ کلام لکھا جو رہتی دنیا تک رہے گا۔ آپ کے کلام کی ایک خاص صفت ہے جو ان کے اشعار میں تاثیر کی بجلیاں بھر دیتی ہے۔ انہوں نے عالم شباب میں شہرت اور عزت کی ایسی بلندیاں دیکھیں جو کہ شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئی ہوں۔ یہاں تک کہ ان کا کلام مکہ مدینہ کے علاوہ برصغیر کے ہر گلی کوچے میں گونجنے لگا۔ کراچی میں قیام کے دوران عروج کا دور تھا۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا قوال، گلوکار ہو گا جس نے ان کا کلام نہ گایا ہو ان کے کلام کا تمنائی نہ ہو۔ ایک عرصے تک ہری پور ہزارہ سرائے نعمت خان اپنے پیر و مرشد جنرل سخی سائیں علی محمد سرکارؒ کے آستانے پر مقیم رہے۔ جہاں انہوں نے دربار کے خادم کی حیثیت میں جاروب کشی بھی کی۔ پھر آپ داتا علی ہجویریؒ کی نگری لاہور میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

آپ کا مزار شریف میانی شریف قبرستان میں ہے۔ آپ کے چاہنے والے عقیدت مند آپ کے دربار پر حاضری دیتے ہیں۔ آپ کا عرس مبارک ماہ جون اور رجب کی پانچ تاریخ میں آتا ہے۔ ولی کامل کی اس سے بڑھ کر اور کیا پہچان ہو گی کہ اس کی حیات تمام انسانیت کے لیے ایک مشعل راہ رہی۔ ان کی حیات ہر ایک کے لیے بلا امتیاز ایک راہبر کی رہی۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ استاد محترم کا نعتیہ مجموعہ ''عشق محمدؐ'' شائع کروایا جو میرے لیے اعزاز کی بات ہے اور سب سے زیادہ اعزاز کی بات یہ ہے کہ استاد محترم کے بہت ہی قریبی دوست بزرگ شاعر اے آر وائی کیو ٹی وی کے ریسرچ سکرپٹ ایڈیٹر مہر وجدانی صاحب جنہوں نے نعتیہ مجموعہ عشق محمدؐ اور استاد محترم کی یاد میں اے آر وائی کیو ٹی وی کے مشہور پروگرام خوشبوئے حسان میں عشق محمد نعتیہ مجموعہ پر تبصرہ اور اُستاد کی سانح حیات کے بارے میں پروگرام دکھایا اور اس پروگرام کی کاوش میں میں اپنے پیارے دوست اور استاد محترم کے پرانے دوست ابرار اسیر صاحب کا بھی شکر گزار ہوں۔ حضرت پرنم الٰہ آبادی کے ساتھ جن کی عقیدت اور میرے ساتھ بے پناہ شفقت ایک انمول اثاثہ ہے اور مہر وجدانی صاحب نے اُستاد محترم کے ساتھ دوستی اور رشتہ خلوص کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے مہر وجدانی جیسے بزرگ شاعر تا دیر سلامت رہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں خوش و خرم رکھے۔ آمین

ذہنی خلجان مار ڈالے گا
کل کا امکان مار ڈالے گا

زادِ رہ میں سفر ہی باندھا ہے
رہ میں سامان مار ڈالے گا

دل کو رہبر کیے رکھا میں نے
یہ ہی نادان مار ڈالے گا

تو نہ آنا مری عیادت کو
تیرا احسان مار ڈالے گا

میں نکلتا نہیں ہوں جنگل سے
کوئی انسان مار ڈالے گا

نیازت علی نیاز

جان کاشمیری اور مکنون احمد جان کی زیر ادارت
شائع ہونے والا 650 صفحات پر مشتمل
سہ ماہی قرطاس گوجرانوالہ
روایتی آب و تاب کے ساتھ
شائع ہو گیا ہے
قیمت -/500 روپے

ملنے کا پتہ
سی 3 رہائشی کالونی، شاہین آباد
بجلی گھر، گوجرانوالہ فون 0333-8105338
Email: maknoonjan@yahoo.com

بونا نہیں بے وقوف

حافظ مظفر محسن

حافظ مظفر محسن کا شمار جدید نسل کے نامور مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ نہایت شگفتہ اور ہلکے پھلکے انداز میں مضامین لکھتے ہیں۔ اُن کی نثر پڑھتے ہوئے قاری کو زوردار قہقہہ نہیں لگانا پڑتا بلکہ زیرِ لب مسکراہٹ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ حافظ مظفر محسن ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت مزاح نگار، کالم نویس اور شاعر ہیں۔ بچوں کے حوالے سے لکھی گئی ان کی کتب بھی کافی مقبول ہیں۔ مزاح نگاری کے حوالے سے اُن کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں ''ہیلمٹ، لفافہ سیاسی آلودگی''، ''بونا مائی فرینڈ''، ''ادھ کھلا گلاب'' اور ''بونا نہیں بے وقوف'' شامل ہیں۔ حافظ مظفر محسن روزمرہ زندگی کے واقعات سے اپنے مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ اُن کے مضامین قاری کو ایک سوچ اور فکر عطا کرتے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب ان کا شمار ملک کے نامور مزاح نگاروں میں ہوگا۔ (ارژنگ)

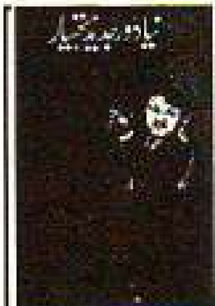

میں باغ میں داخل ہوا۔ تھری پیس سوٹ اور ٹائی کے سبب مجھے تھوڑی مشکل محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹائی کی گرہ کو تھوڑا ڈھیلا کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس دوران مجھے وہ نظر آ گئی۔ حسبِ معمول اس بار بھی اُس نے نیلے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی اور پاؤں سے ہلکی ہلکی ''چھن چھن'' کی آوازیں باغ کے ماحول کو خوش رنگ بنا رہی تھیں۔ اُس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے مسکرا کر دیکھا...... اور گزر گئی۔ میں نے بھی سر جھکایا جیسے میں نے اس کے سلام کا جواب دیا ہو۔ چھن چھن کی آواز آج گویا نئی تبدیلی تھی۔

یہ معمول تھا ہم دونوں کا...... ایک عرصے سے۔

کبھی میں نے اُسے یا اُس نے مجھے باقاعدہ سلام نہیں کیا تھا۔ بس...... وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ یہ مسکرانا اور جواب میں دوسرے فریق کا سر جھکانا معمول کی بات تھی۔ ہم دونوں نہ تو دوستی کا دعویٰ کر سکتے تھے نہ کسی جذباتی وابستگی کا ہی۔

''ارے! یہ کیا؟...... وہ...... وہ اس قدر چھوٹے قد کی ہے!'' میں نے سوچا اور اس کی قامت پر غور کرنے لگا۔ تب شاید پہلی بار میں نے مڑ کے اُسے دیکھا۔

''ارے! یہ تو میری طرح پیچھے مڑ کے دیکھنے لگی ہے۔''

میں چونک سا گیا۔ مسکراہٹ ابھی تک چہرے پر موجود تھی۔ شاید اُس کی شخصیت ہی ایسی تھی۔

مجھے بچپن میں سکھے ابتدائی سبق یاد آ گئے جب میں والد محترم کے ایک استاد باؤ اللہ بخش سے مسمریزم سیکھنے جایا کرتا تھا۔ وہ سب نظر کا کمال ہوتا تھا۔ ان کی نظر میں اتنی جاذبیت ہوتی کہ جس جگہ دور دیکھتے، وہ جگہ جیسے ان کے قبضے میں آ جاتی۔ استاد جی نے مجھے کتابیں بھی دیں، اس فن کے اسرار و رموز زبانی بھی بتائے مگر یہ کام نہ کرنے کا مشورہ بھی ساتھ میں دے دیا۔

میں ایک دفعہ بھائی کے ساتھ گھر سے نکلا۔ آپا فضیلت بھی جو ہمارے سامنے گھر میں رہتی تھیں، باہر آ گئیں۔ بھائی نے آہستہ سے کہا ''دیکھو آپا فضیلت کی چپل کس قدر خوبصورت ہے اور نیلے سوٹ سے میچ بھی کرتی ہے۔''

بھائی نے ابھی فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ آپا فضیلت منہ کے بل گری۔ بے چاری کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ پاؤں میں موچ بھی آ گئی۔ مجھے ایک ہی وقت میں بھائی پر غصہ بھی آیا اور آپا فضیلت پر ترس بھی...... مگر جو ہونا تھا، ہو گیا تھا۔

بھائی نے اپنے ہاتھ کو دانتوں سے خود ہی چبا ڈالا اور بولا ''بہت سوچتا ہوں کہ ایسا نہ کروں...... مگر غیر ارادی طور پر نظر کام کر جاتی ہے۔ یہ ویسے ہی ہو گی۔''

میں نے شاید اُس کی گردن پر نظر جمائی تھی۔ جو اُس نے بھی گردن پیچھے موڑی۔ اس دوران میری نظر جج صاحب پر پڑی۔ وہ بھی مجھے اپنے قد سے بہت چھوٹے نظر آئے۔ میں اُنہیں بھی مڑ کے دیکھنے لگا۔ حیرت میں گم تھا کہ یہ سب کے قد آج چھوٹے کیوں لگ رہے ہیں۔

جج صاحب بھی اسی باغ میں روزانہ آتے ہیں۔ خاصے لمبے قد کے آدمی تھے لیکن آج نہ جانے کیوں پستہ قد والے لگ رہے تھے۔

''اوہ! یہ بلی اس قدر چھوٹی۔'' میں نے غور کیا کہ یہ بلی تو اچھی خاصی تھی...... اور...... آج یہ زمین میں کیوں گھسی ہوئی ہے؟ ویسے اس بلی کی یہ جسامت خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ مجھ پر کسی چیز کا غلبہ طاری ہو گیا۔ میں کھو سا گیا۔

''یہ...... یہ درخت!'' میں نے عینک کے شیشے صاف کئے۔ ''ہاں! واقعی یہ درخت بھی خاصے چھوٹے سائز کے معلوم ہو رہے ہیں۔''

اور پھر مجھے وہ سب کے سب درخت چھوٹے چھوٹے لگنے لگے۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ واک بھی آج خاصی ڈسٹرب ہو رہی تھی اور ذہن بھی خاصا منتشر تھا۔ ڈاکٹر گلزار کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ سائکاٹری سے وابستہ ہے اور میرے شہر کے بڑے ہسپتال میں ایم۔ ایس کے عہدے پر فائز ہے۔ بچپن کا دوست ہے اور اس دوستی نے مجھے بھی آدھا ڈاکٹر بنا رکھا ہے۔

ڈاکٹر گلزار کہتا ہے کہ جب ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو تو بندے کو آغاز میں یوں لگتا ہے جیسے زمین سے آوازیں آ رہی ہوں۔

''کہیں میں بھی تو؟''

میرا دل گھبرانے لگا۔ ڈاکٹر گلزار مذاق میں اکثر مجھے کہتا تھا۔ ''تم چالیس کے بعد پاگل ہو سکتے ہو؟''

حالانکہ میں اُس کمینے شخص کو اُس کا ہاتھ دیکھ کر ہمیشہ کہتا ہوں ''ڈاکٹر! تو غریب آدمی تھا۔ اب اچھے عہدے پر ہے لیکن تیرا مستقبل روشن ہے۔ مرنے سے پہلے تو کروڑوں روپے بینکوں میں چھوڑ کر ادھر اُدھر دیکھے گا اور حیرت سے مر جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اتنے ڈھیر سارے روپے......!''

وہ میری اس بات کو سچ سمجھتا ہے اور جب بھی ملتا ہے، اپنا ہاتھ میرے سامنے پھیلا کر سنجیدگی سے پوچھتا ہے ''کب بنوں گا میں کروڑ پتی؟''

''ہیں؟'' میری نظر اپنے سائے پر پڑی ''اف اللہ! میں اس قدر پست قد کا کیسے ہو گیا؟''

میں پانچ فٹ پانچ انچ قد کا معقول قامت شخص ہوں لیکن اس وقت میں اڑھائی فٹ کا لگ رہا ہوں۔

''کہیں میں بونا تو نہیں ہو گیا؟'' میں گھبراہٹ میں سوچنے لگا۔ دل گرفتہ سا۔ بچپن میں ہمارے محلے میں گجروں کی حویلی میں ایک بہت بڑا بوہڑ کا درخت ایستادہ ہوا کرتا تھا۔ ویران سی جگہ تھی۔ کتے اور درخت اور درختوں پر پرندے بہت بڑی تعداد میں نظر آیا کرتے تھے لیکن انسان کبھی کبھار دکھائی دیتا۔ میری عمر کے بچے وہاں سے کم گزرتے۔ بڑے دل گردے والوں کو میں نے وہاں سے بھاگ کر گزرتے دیکھا تھا۔ شاید خوف کی وجہ سے...... عام محلوں میں پرانے اور متروک گھروں سے اکثر بچے خوامخواہ گھبراتے ہیں۔ جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کے خوف سے...... کیونکہ محلے میں مشہور تھا کہ گجروں کی حویلی میں جو نہایت بوسیدہ اور پرانا کنواں ہے، اُس میں بونے رہتے ہیں ......اور عام طور پر وہ بونے شام کے بعد ہی کنویں سے باہر آتے ہیں اور گلی تک نکل آتے ہیں۔ دادا جان نے ایک بار بتایا بھی تھا کہ بونے خدا کی مخلوق ہیں لیکن ہوتے بے ضرر ہیں۔ میں نے حسبِ معمول تفصیل چاہی تو پتا چلا کہ دادا جان کو بھی اس بارے میں زیادہ علم نہ تھا...... شاید......

یا شاید اُس وقت اُن کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ تبھی بونوں کے حوالے سے تشنگی رہ گئی تھی۔ میں نے بونوں پر کئی کتابیں پڑھیں لیکن سب فلمی باتیں لگتی تھیں۔

میں نے ایک دن جان بوجھ کر حویلی کے پاس سے گزرنا چاہا لیکن بونوں کے بارے میں سوچ کر ڈر گیا۔ خوف سے جب انسان کی ٹانگیں کانپنے لگیں تو دل خوامخواہ گھبرا جاتا ہے۔ واپس تنور والی گلی میں چلا گیا۔ یہ خاصا لمبا راستہ تھا۔

اُسی رات میں نے خواب دیکھا۔ ایک نہایت خوبصورت شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گفتگو اور انداز سے تو بڑا اور معمر آدمی لگتا تھا لیکن اُس کے چہرے کی معصومیت بتا رہی تھی کہ جیسے وہ محض دس سال کا بچہ ہو۔ اُس نے مجھے بتایا ''ہم کوئی مظلوم سی مخلوق ہیں۔ ہم بھی انسانوں کی ہی قسم ہیں لیکن اب ہمیں انسانوں سے ڈر لگتا ہے۔ اس لئے ہم غاروں، ویرانوں اور پرانی جگہوں پر رہتے ہیں جہاں سے عام طور پر انسان کا گزر نہ ہو۔''

''لو جی! ہمارا مسئلہ حل ہو گیا۔''

خواب کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ مخلوق تو خود انسانوں سے ڈرتی ہے، چھپ کر رہتی ہے، رات گئے اندھیرے کا سہارا لے کر عام گزر گاہ تک آتی ہے اور انسان کو دیکھ کر پھر سے چُھپ جانے میں ہی عافیت محسوس کرتی ہے۔ پھر بھلا اُس مخلوق سے ڈرنے کا کیا جواز ہے؟

اُس خواب کے بعد میں نے گجروں کی حویلی کے پاس سے گزرنا معمول بنا لیا۔ خوف نام کی کوئی چیز اب نہ رہی۔ میرے ہم عمر اب الٹا مجھ سے خوف زدہ تھے۔ آج تک میرے کلاس فیلوز مجھے بچپن کی وہ باتیں یاد کراتے ہیں۔ بہت سے دوست اب بھی مجھے کہتے ہیں کہ ''تم جنات میں سے ہو...... یا پچھلی چند پشتوں میں تمہارے آباؤ اجداد جنات میں سے ہوں گے۔''

چونکہ میں نے آج تک اس سوال کی وضاحت نہیں کی یا کہ یہ غلط اندازہ قائم کیا گیا ہے۔ میرے بارے میں......

وہ سب میرے سامنے جنات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے پرہیز کرتے ہیں اور اس راز کو شاید راز ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے میں بھی چاہتا ہوں یہ پردہ پڑا ہی رہے۔

جب کبھی ہم مری جائیں اور وہاں ہوٹل میں اکٹھے قیام کریں تو صبح اُٹھ کر شیخ اصغر تو کہہ ہی دیتا ہے ''تم ساری رات نہ جانے کن لوگوں سے باتیں کرتے رہتے ہو۔''

میں نے دیکھا ہے کہ وہ بھی مجھ سے خوفزدہ سا رہتا ہے...... ایسے سفر کے دوران۔

اب گجروں کی حویلی میں کوئی پتنگ کٹ کر آ گرتی تو اُس پر میرا حق ہوتا تھا کیونکہ کسی بچے کی مجال نہ تھی کہ وہ اُس حویلی میں جانے کا تصور بھی کرے...... اور...... اور میں آرام سے حویلی میں چلا جاتا، پتنگ پکڑتا اور واپس آ جاتا۔ اس عمل سے میری سب بچوں پر دھاک بیٹھ گئی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ پختگی آتی گئی۔

اب میں واک کے دوران خود کو بونا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو درخت بھی مجھے چھوٹے چھوٹے سے لگنے لگے۔ میں نے اس بونے سے موازنہ کیا جسے میں نے بچپن میں خواب میں دیکھا تھا۔ وہ زیادہ چھوٹا تھا اور اس کا انداز بھی اس سے بہت مختلف تھا۔ میری سانس گھٹنے لگی۔ میں نے اپنی ٹائی جو پہلے ہی خاصی ڈھیلی کر چکا تھا، اتار کے ہاتھ میں پکڑ لی۔ میرے سر پر بوجھ سا بنتا چلا جا رہا تھا۔ سردی میں گرمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جس طرف دیکھتا تھا، یوں لگتا تھا جیسے میں زمین کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ پھر مجھے سڑک بھی خاصی قریب محسوس ہونے لگی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوا۔ زندگی میں جن، بھوت، سائے وغیرہ سے مجھے کبھی ڈر نہیں لگا تھا...... لیکن آج میں ڈر رہا تھا۔

''گاڑی میں کیسے بیٹھوں گا؟''

مجھے نواز ڈرائیور یاد آ گیا اور میری ہنسی نکل گئی۔ نواز ڈرائیور کا قد کافی چھوٹا ہے۔ وہ جب گاڑی چلانے لگتا ہے تو ڈرائیونگ سیٹ پوری طرح آگے کر لیتا ہے۔ پھر بھی بمشکل اُس کے پاؤں بریک تک پہنچ پاتے ہیں۔ میں نے غور کیا تو مجھے لگا کہ میں نواز ڈرائیور سے بھی چھوٹا ہو گیا ہوں۔

طرح طرح کے خیالات دل و دماغ کو ماؤف کر رہے تھے ''دوست دیکھیں گے تو کیا محسوس کریں گے؟''

ٹی۔وی ڈراموں میں کام کرنے والا کوڈو یاد آ گیا...... پھر خیال آیا ''عید پر لوگوں سے عید کیسے ملا کروں گا۔؟! اک کوڈو سے تو عید مل کر خوشی ہو گی۔ لمبے قد والے دوستوں سے کیسے ملوں گا۔ زندگی لگتا ہے اک مذاق بن کے رہ جائے گی۔ یا اللہ خیر!''

بار ہا غیر سنجیدہ باتیں سوچ سوچ کر میں نے خود کو ہنسانا چاہا مگر...... مگر پھر اک دم دھیان واپس اپنے پستہ قد کی طرف چلا جاتا اور بہت سی سوچیں میرے دماغ کو جکڑ لیتیں۔ عجیب اور لاعلاج سا مرض لگنے لگا۔ آج مجھے بھی احساس ہوا جنات کی طاقت کا ورنہ میں سمجھتا تھا کہ جنات بھی اب بے ضرر سی مخلوق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایف سولہ طیارے کے آگے جنات یقیناً بے بس ہوں گے...... اور اس کی گھن گرج سے یقیناً خوفزدہ بھی رہتے ہوں گے۔

میں نے موبائل پکڑا۔ صنوبر خان کا نمبر ملایا ''خان یار! اک مشکل آ پڑی ہے۔ جناح باغ میں ہوں۔ آ جاؤ تو

بہتر ہے ورنہ میں مر بھی سکتا ہوں۔''

''اوہ سوری! میں تو کل شام کی فلائٹ سے کوئٹہ آ گیا تھا۔ گل خان کو فون کر لو۔ وہ لاہور ہی میں ہے۔ لو خدا حافظ کیونکہ اک مرگ پہ آیا تھا اور اب جنازہ اٹھنے والا ہے۔ اور ہاں! مرنے والی بات میں صداقت نہیں لگتی۔ پھر بھی ایسا ہو گیا تو کوئٹہ والے جنازے سے سیدھا تمہارے جنازے پر پہنچو نگا۔''

اک دم ذہن جنازے کی طرف چلا گیا۔ اگر میں اس حال میں مر گیا تو میرا جنازہ!

ہنسی کا فوارہ منہ سے نکلا۔ سوچا ''میرے لئے چھوٹی سی بچہ چارپائی تلاش کی جائے گی اور مجھے بچوں کے قبرستان میں دفن کر دیا جائے گا۔''

ذہن میں اک نیا آئیڈیا بھی آیا کہ بچوں کے لئے علیحدہ قبرستان بھی بنائے جا سکتے ہیں۔

یہ سوچ کے میں نے ماتھے پہ ہاتھ پھیرا۔

''وعلیکم السلام!'' اُس نے کہا اور رُک گئی۔ شاید اُسے محسوس ہوا تھا کہ میں نے ہاتھ سے سلام کیا تھا۔ حالانکہ مجھے تو اپنی پڑی تھی۔ میں اُسے اس حال میں کیونکر سلام کرتا؟

''کیا کوئی پریشانی ہے؟'' وہ حیرت سے مستفسر ہوئی۔

''آئیں بینچ پہ بیٹھ جاتے ہیں۔'' اُس نے بینچ کی طرف جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا کہا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ اک فقیرنی آدھمکی ''جوڑیاں سلامت رہن!''

''باغ کا سب سے سوہنا جوڑا ہے یہ!''

''ایک دس کے نوٹ کا سوال ہے بابا!''

اُس نے فقیر کو سو کا نیا نوٹ پرس سے نکال کر دیا...... مسکراتے ہوئے ...... مسکرانا گویا اُس کا معمول تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔

''آپ خاصی فراخ دل لگتی ہیں۔'' میں نے اُس کی خوبصورت نیلی شرٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ایسے لگا جیسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کہیں سے آیا ہو۔

''آپ نے دیکھا نہیں کہ اُس نے ہمیں کتنی خوبصورت دعائیں دی ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

فقیر کا آخری فقرہ میری سماعت سے ٹکرایا ''اللہ چن جیا پتر دیوے۔''

اُس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے ''ابھی شادی ہوئی نہیں اور بیٹے کی دعا......''

''دل کی گہرائی سے کی جانے والی یہ دعا کہیں پوری نہ ہو جائے......'' وہ بڑبڑائی۔ میں مزید گھبرایا۔

''ہاں تو...... بتائیں ناں۔ آپ کئی سال سے واک کے دوران میرے پاس سے گزرتے ہیں۔ کبھی بندہ سلام دعا ہی کر لیتا ہے۔''

''ہاں جی! غلطی ہو گئی۔'' میں نے انجانے میں کہا۔

''کوئی اچھی سی غلطی بھی کر لیں اب۔ عمر کافی ہو گئی۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے آپ بھی غیر شادی شدہ ہیں ابھی۔''

''آپ شکل سے تو اس قدر شریر نہیں لگتیں لیکن باتیں خاصی دلچسپ کرتی ہیں۔ آپ کے ساتھ تو لمبے سے لمبے سفر میں بھی بندہ بوریت محسوس نہیں کر سکتا۔ چلیں ورلڈ ٹور پر۔'' وہ ہنس کے اٹھنے اور چلنے کے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''چلیں گے ضرور۔'' میں نے کہا۔

وہ پھر بولی، ''تو آئیں پھر چلتے ہیں ...... کسی بہت لمبے سفر پر......''

اک دم سے میں نے غور کیا۔ یہ ساری گفتگو تو بہت سوچ سمجھ کے کرنے والی ہے۔ یہ خاتون تو شاید سنجیدہ ہے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا ''آپ کی آنکھیں تو براؤن ہیں۔''

وہ بولی ''اور آپ کی کالی سیاہ۔''

میں نے جواب دیا ''کیا خوبصورت کمبی نیشن ہے۔''

وہ ہنس کے بولی ''اچھا چھوڑیں یہ باتیں۔ پہلے بتائیں کہ آپ پریشان کیوں ہیں آج...... کیا کوئی مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟'' اُس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اصل میں......''

''آج آپ نے عام دنوں سے کہیں زیادہ واک کر لی ہے۔'' وہ ایسی باتوں کو خوب انجوائے کر رہی تھی۔ ویسے مجھے بھی اب اچھا لگنے لگا تھا۔

''آپ کے علم میں ہے یہ بات؟''

''جی...... جی...... اچھا جی......'' میں نے اُس کے سنجیدہ سوالوں پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں آج ایک مخمصے کا شکار ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا قد چھوٹا ہو گیا ہے۔ یہ درخت چھوٹے ہو گئے ہیں۔ آپ کا قد بھی مجھے آج چھوٹا چھوٹا لگ رہا ہے۔'' مجھ پر پھر خوف کی کیفیت چھا گئی اور میں نے اُسے اپنا ہمدرد اور شاید معالج سمجھ کے سب کچھ اگل دیا۔

وہ ہنسنے لگی۔ خوب زور زور سے۔ پھر قہقہے پہ قہقہے لگانے لگی۔ اس دوران اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے دایاں ہاتھ آگے کیا تو اُس نے میرے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا ''کمال شریف آدمی ہو!'' سادہ دل وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''مجھے محسوس ہو رہا تھا میں بونا ہو گیا ہوں۔ بونا آپ سمجھتی ہیں ناں۔ بہت پست قد والا۔''

''آپ بونے نہیں بیوقوف ہو گئے ہیں۔ مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی پھر اُس نے دونوں ہاتھ میرے چہرے پر لگائے اور نہایت محبت سے میرے چہرے پر لگی کالے شیشوں والی عینک اتار لی۔ مجھے پکڑ کر کھڑا کر دیا'' آپ چل کر دیکھیں۔''

میں چلنے لگا۔ بے اختیار میرے لبوں سے برآمد ہوا'' ہائیں یہ سب تو ٹھیک ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ یہ صرف عینک کی وجہ سے تھا؟

''جی ہاں'' وہ ہنستے ہوئے بولی'' میں آنکھوں کی ڈاکٹر بھی تو ہوں ناں مقامی ہسپتال میں۔ عینک کے شیشے کبھی کبھی لہریں آ جاتی ہیں اور کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔''

''میری عینک''...... میں نے ہاتھ بڑھایا۔

''اوہو! ابھی بھی آپ کو اس عینک کی ضرورت ہے۔ اس نے دن بھر آپ کو پریشان کیے رکھا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''نہیں.. نہیں آپ لے لیں۔'' میں نے اُس کے موتی جیسے چمکتے دانتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے! چلتے ہیں۔'' اُس نے لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے...... اوکے...... خدا حافظ'' میں نے جواب دیا اور مخالف سمت چل پڑا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ بھی مجھے پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ نہایت سنجیدہ انداز میں...... جیسے کوئی ہزاروں میل کا سفر کر کے مہمان بننے آئے اور آپ اُسے پہچاننے سے انکار کر دیں...... کسی نہایت بیوقوف شخص کی طرح......

انجلی

رانا خادم علی انجم

''کڑوی حقیقت'' کے نام سے جو افسانے خادم علی انجم نے لکھے ہیں تو یہ افسانے، افسانے نہیں بلکہ کتاب کے عنوان کی طرح ''اسم بامسمیٰ'' ہیں۔ اچھا تخلیق کار وہ ہے جو زندگی کو اپنے اندر کی روشنی سے دیکھتا ہے اور اپنے نظریے، مشاہدے اور تجربے کو سپردِ قرطاس کرتا ہے۔ خادم علی انجم کے افسانوں کے موضوعات اور کردار خیالاتی یا تصوراتی نہیں بلکہ اُس کی زندگی کے اردگرد چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے کردار ہیں۔ مبالغہ کہانی کا حُسن ہے۔ ہوسکتا ہے زیب داستاں کے لیے خادم نے تھوڑا بہت مبالغے سے کام لیا ہو مگر کڑوی حقیقت یہ ہے کہ اُس کے حریت پسند قلم نے خود اُس کی ذات کو بھی معاف نہیں کیا اور حقیقت کی سولی پر چڑھا دیا ہے۔ خادم علی انجم کی افسانوں میں حقیقت نگاری اُسے افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں علیحدہ شناخت عطا کرسکتی ہے۔ میری دُعائیں اپنے اس شریف دوست کے ساتھ ہیں۔ (حسن عباسی)

سائنس سٹوڈنٹ ہو تمہیں مینڈک، خرگوش چوہے یا پھر لیچ (Leech) وغیرہ کی چیڑ پھاڑ یعنی پریکٹیکل آپریشن کے سوا کسی چیز کی خبر نہیں۔ انسانی جذبات سے عاری ہو تم۔ موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ لگا کر ہر وقت کتابوں میں کھویا رہنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ محترمہ کتابوں کے علاوہ بھی دنیا میں بہت کچھ ہے۔ جو دیکھنے سے، احساس کرنے سے نظر آتا ہے۔

حیدر نے انجلی سے طنزاً کہا اور پھر اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

آئے بڑے جذبات والے، تم کو کیا معلوم کہ جذبات کس چڑیا کا نام ہے؟ اور ویسے بھی جذباتی لوگ تھوڑے سے بے وقوف ہوتے ہیں۔

انجلی مصنوعی غصے سے چلاتے ہوئے بولی۔ تمہارے خیال میں دانشور اور مصنفین پاگل ہوتے ہیں۔ حیدر عالمانہ انداز میں جرابیں اُتارتے ہوئے کہنے لگا۔

میر و غالب کے چند اشعار ازبر کر لینے سے کوئی شاعر اور ادیب تو نہیں بن جاتا ہے۔ دوسروں کے خیالات چوری کیے۔ اِدھر اُدھر سے الفاظ پکڑے اور اپنی نظم یا کہانی تیار کر لی۔ جہاں کہیں محفل میں خوبصورت لڑکی دیکھی، جلے کٹے چند شعر سنا دیے۔ خود کو قابل رحم باور کروانے میں لگ گئے تاکہ ان کی نظر التفات حاصل ہو سکے۔

میں جانتی ہوں ایسے لوگوں کے قول و فعل میں کس قدر تضاد ہوتا ہے۔ انجلی نے متکبرانہ انداز سے کہا اور بالوں کی اُلجھی ہوئی لٹ کو سنوارنے میں مشغول ہوگئی۔

حیدر دراز قد دُبلا پتلا، رنگ سفید، بڑی بڑی پرکشش آنکھیں، تیکھے نقوش، چال ڈھال اور لباس سے سادگی ٹپکتی تھی۔ جبکہ انجلی سانولی سلونی سر پر براؤن پھولوں والا آف وائٹ کلر کا سکارف اوڑھے، تھوڑی ستویں ناک، اُس پر موٹے شیشوں والا چشمہ، کالے رنگ کی قدرے گہری آنکھیں، میانہ قد، گول چہرہ اور اُس گول مٹول چہرے پر ابدی پریشانی کے آثار تھے جیسے ابھی کچھ کہا تو وہ رو پڑے گی۔

حیدر اور انجلی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بچوں کی طرح لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ انجلی ایم ایس سی کر کے فارمیسی کا ڈپلومہ کر رہی تھی اور اس میں اُس کا آخری سال تھا۔

حیدر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اُس میں شاعری کا جذبہ موجزن تھا۔ البتہ دونوں میں سائنس و آرٹس کا فرق نمایاں تھا۔

انجلی گوئٹے، شیلے، ورڈز ورتھ، ارسطو ایلیٹ اور شیکسپیئر کی پیروکار تھی۔ جبکہ حیدر، غالب، میر، سودا، مومن، اقبال اور وارث شاہ کا دلدادہ۔

انجلی تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟ حیدر نے کرسی کو آگے کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

حیدر کیا بتاؤں؟ تم تو جانتے ہو۔ میں نے مالی حالات نامساعد ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر بس سٹاپ کا گھر سے تین کلومیٹر کا پیدل راستہ لیکن میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور منزل کی طرف گامزن رہی لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں اس سب کے پس پردہ میرے والد محترم کا دست شفقت تھا۔ انجلی نے مدھم آواز میں ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

بات کیا ہے؟ حیدر نے متجسس لہجے سے پوچھا ابو کل سے سی ایم ایچ ہسپتال لاہور میں ایڈمٹ ہیں۔ شوگر لیول بہت ہائی ہے۔ کمزوری اس قدر کہ چل پھر نہیں سکتے۔ میں ابو کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ وہ میرے لیے ہمدرد، دوست، شفیق باپ اور عظیم رہبر ہیں۔ انجلی قدرے جذباتی ہوگئی۔

بظاہر بے حس نظر آنے والی لڑکی کے سینے میں کتنے طوفان پنہاں تھے۔ یہ حیدر پر آج عیاں ہوا۔ حیدر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انجلی کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اجنبی ہو۔

اگلے روز انجلی اور حیدر سی ایم ایچ لاہور آئی ٹی سی میڈیکل وارڈ میں بیڈ نمبر سات پر واصف صاحب کے پاس کھڑے تھے۔

ابو جی! حیدر صاحب آئے ہیں آپ سے ملنے۔ انجلی نے اپنے باپ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

واصف صاحب ریٹائرڈ فوجی تھے۔ سانولی رنگت، گول چہرہ، ستویں ناک، آنکھوں کی بینائی عمر کے ساتھ ساتھ کم ہوگئی تھی۔ بیس بائیس سال سے شوگر کے مرض میں مبتلا تھے۔ اس قدر بیماری کے باوجود جو کوئی تیمارداری کے لیے آتا تو بارعب آواز سے کہتے I am better now, I am fine

بڑے دلچسپ اور پُراعتماد انسان ہر بات سچی اور کھری کہنے کے عادی۔

حیدر بیٹا تم کب آئے؟ واصف صاحب نے کروٹ

بدلتے ہوئے کہا۔

ابھی آیا ہوں انکل۔ اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ حیدر نے واصف صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

بس ٹھیک ہوں خدا کا شکر ہے۔ لیکن حیدر صاحب آپ میری بیٹی کے لیے دعا کریں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے۔

ابو جی حیدر صاحب کوئی ولی اللہ ہیں کوئی بزرگ ہیں جو میرے لیے دعا کریں گے۔ ان کی تو بددعا نہیں لگتی دعا کیسے لگے گی۔ انجلی نے بات کا موضوع بدلنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔

دراصل تمہارے ابو جوہری ہیں۔ ہیرے کی قدر خوب جانتے ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ ہیرا ملے تو گدھے کے گلے میں باندھ دیں۔ حیدر نے مریض کی فائل کے ورق اِدھر اُدھر کرتے ہوئے کہا اگر ہیرا گدھے کے گلے میں باندھنے کے قابل ہو تو باندھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ انجلی قدرے شوخ سی ہوگئی۔

دن گزرتے گئے لیکن واصف صاحب کی صحت بحال نہ ہوسکی۔ بلکہ ہر آنے والا دن کمزوری و نقاہت میں اضافہ کرتا گیا۔ آخرکار ایک دن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ واصف صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (اللہ ان کی مغفرت کرے آمین)

جنازہ اُٹھا تو حیدر کو یقین نہیں آ رہا تھا اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بھیانک سپنا دیکھ رہا ہو۔ کیونکہ واصف صاحب تو ہمیشہ کہتے تھے۔

I am fine sone حیدر کے کان میں یک دم ایک آواز گونجی ''حیدر صاحب! میری بیٹی کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے میں اپنی بیٹی کے لیے بہت فکرمند ہوں۔''

انجلی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ غم سے نڈھال یوں تو انجلی کے چھ بھائی تھے لیکن انجلی کی قابلیت کے سامنے چھ کے چھ زیرو تھے اور ناکامی کے کنویں پہ پانی بھرتے نظر آتے تھے۔ ناقابل برداشت صدمہ، ایک رہبر سے جدائی ایک دوست کی محرومی، ایک مشکل وقت کے ساتھی سے دوری۔ واصف صاحب انجلی کا والد ہی نہ تھا بلکہ ہمراز اور ہمدرد بھی تھا۔ انجلی کے سر پر اچانک غم کا پہاڑ گر پڑا۔

حیدر اور انجلی ایک ہی سکول میں پڑھاتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد انجلی نے سکول آنا چھوڑ دیا اور اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

انجلی سنا ہے تم نے آگے پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ حیدر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

ہاں ٹھیک سنا ہے تم نے من نہیں کرتا۔ انجلی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

مگر کیوں؟ حیدر نے بے چینی کے عالم میں اُٹھتے ہوئے کہا۔

اس لیے کہ ہمت جواب دے چکی ہے۔ خود سے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ راستے جو مشعل راہ گردانتی تھی اب تاریک لگتے ہیں۔ ہر طرف بے چینی و بے دلی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کیا کروں کہاں جاؤں کس سے فریاد کروں۔ انجلی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

حیدر سوچنے لگا کیا یہ وہی انجلی ہے جس کی ہر سوچ میں آگے بڑھنے کی لگن اور بڑے سے بڑا چیلنج قبول کرنے کا عزم و یقین اس قدر پختہ تھا کہ کوئی چیز ناممکن نہ لگتی تھی۔

حیدر گھر واپس آ کر دیر تک اسی سوچ میں محو رہا کہ کیا انجلی یہ سب ٹھیک کر رہی ہے نہیں نہیں یہ سب ٹھیک نہیں۔ اس طرح تو واصف صاحب کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔ وہ انجلی کو جس مقام پر دیکھنا چاہتے تھے اُس خواب کا کیا ہوگا۔ حیدر بہت فکرمند تھا۔ حیدر صاحب میری بیٹی کے لیے دعا کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے۔ کوئی حیدر کے کان میں سرگوشی کرتا۔

حیدر اگلے روز انجلی سے ملا اور کہنے لگا انجلی میں نے تمہارے فیصلے کے بارے میں بہت سوچا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارا آگے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ ختم کرنے کا فیصلہ سراسر غلط اور احمقانہ ہے۔ دیکھو! تم ہم سب سے ناانصافی کر رہی ہو۔ سکول کے بچوں کے ساتھ، اپنے والد کے خواب کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اپنے ساتھ۔

روحِ ادب اور جمالِ حرف و معنی کا استعارہ
زرنگار فیصل آباد
مدیر ضیاء حسین ضیاء
قیمت: -/700 روپے
صفحات 560
ملنے کا پتہ
زرنگار بک فاؤنڈیشن
زرنگار ہاؤس (P.148.149) عمران روڈ
خیابان کالونی (مدینہ ٹاؤن) فیصل آباد
0300-9654110
Email:allama_zia@hotmail.com

مدیر اعلیٰ محمد شکور اور مدیر خالد علیم کی زیرادارت
ماہنامہ فانوس لاہور
کا تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
قیمت: -/100 روپے
ملنے کا پتہ
ماہنامہ فانوس، ۶-سلیم آرکیڈ، ٹمپل روڈ، لاہور
042-36362984
Email:monthlyfanoos@yohaoo.com

بہ گفتارِ محبت لب کشودم
بیاں ایں راز را پوشیدہ تر کرد
(اقبالؒ)

افسانہ

آئیڈیل کی تلاش

عنصر علی بریار

عنصر علی بریار اپنے اور قاری کے غم غلط کرنے کے لیے کوئی سہانا خواب نہیں دکھاتا اور نہ ہی اُس کی تحریر کہیں قہقہہ بنتی ہے۔ بلکہ وہ زندگی کی تلخیوں، حادثات اور دُکھوں پر کہانی بنتے ہوئے خود بھی گہری اُداسی میں ڈوب جاتا ہے اور قاری کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھی اس اُداسی میں ڈوبنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے اس کتاب کی جتنی کہانیاں پڑھیں ہیں وہ مجھے اس حوالے سے بہت اچھی لگی ہیں کہ ایک تو ان میں ہمارے معاشرے کے بھیانک اعمال کا عکس ہے۔ دوسرا ہر کہانی کا انجام ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر ہم کس سمت جا رہے ہیں اور ہماری منزل کیا ہے؟ میں انہیں اصلاحی کہانیاں تو نہیں کہوں گا البتہ یہ قاری میں ایک مثبت سوچ جنم دینے والی کہانیاں ضرور ہیں۔ رشتوں کے حوالے سے بھی عنصر کی تحریریں بہت زیادہ جذباتی اور منفرد ہیں۔ (حسن عباسی)

دیہاتی لوگ اپنے دیہاتوں میں شہروں سا ماحول بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ تعلیم و ہنر کی طرف سب کی توجہ بڑھتی گئی۔ پکی سڑکیں، سکول و کالج، ہسپتال، بجلی اور گیس جیسے مطالبے حکومت سے پورے کیے جانے لگے۔ دیہاتی نوجوان اپنے وطن کے کونے کونے میں اپنے دیہاتوں کا نام روشن کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پوری دنیا میں ان کی قابلیت کا چرچا ہوا۔ البتہ اس کے باوجود بھی دیہاتی لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو زیادہ پسند نہ کرتے۔ جس وجہ سے دیہاتی لڑکیاں دیہاتی لڑکوں سے پیچھے رہ گئیں اور اپنی قابلیت اپنے دل میں چھپائے اپنے اپنے دیہاتوں میں ہی بیٹھی رہیں۔ بس اب دیہات کے ہر شخص کی یہی خواہش رہ گئی تھی کہ وہ اپنا نیا مکان تعمیر کر لے۔ اس بات کا ثبوت میرے ماموں کا مکان تھا جو کہیں سے توڑا جا رہا تھا اور کہیں سے بنایا جا رہا تھا۔

میں اپنے ماموں کے گھر میں داخل ہوا۔ معمار دیوار پر اینٹیں لگا رہا تھا۔ مزدوروں کی جگہ پر میرے ماموں اور اُن کا بیٹا ادریس کام پر لگے ہوئے تھے۔ ادریس معمار کے کہنے پر اُسے اینٹیں، ریت، سیمنٹ وغیرہ پکڑاتا۔ ماموں جان اور ادریس جو مزدوروں کی جگہ پر کام کر رہے تھے اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ ان کے کرائے کے مزدوروں کو دینے والے پیسے بچ رہے تھے اور شاید اُسی بچت کا ایک حصہ میں بھی تھا جو ماموں جان کے بلاوے پر اُن کے گھر پہنچ چکا تھا۔

میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کو سلام کیا۔ مجھے ان کمروں میں سے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا جن کی چھتیں ابھی اُتارنے والی تھیں۔ میں مہمان تھا اور دیہاتی لوگ جیسے بھی مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں ویسی میری بھی ہوئی۔ کھانا وانا کھلایا، لسی بھی پلائی اور پھر سب خوشی خوشی مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ ہر کوئی مجھے بہت عزت دے رہا تھا۔ میرے آنے پر سارے گھر والے بہت زیادہ خوش تھے۔ میں بھی سمجھ گیا۔ میں باری باری سب کے چہرے پڑھ رہا تھا۔ سب کے چہروں سے خوشامد کی لہر جھلک رہی تھی۔ کیونکہ انہوں نے مجھ سے باتیں اس انداز سے کیں جس سے وہ مجھے وہاں آنے کا مقصد بھی یاد دلا رہے تھے اور ساتھ ساتھ مزے کی بات یہ تھی کہ میرے دل کو تسلی بھی دے رہے تھے۔

میں خاموش بیٹھا اُن کی باتیں سنتا رہا اور کبھی کبھی جھوٹی مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا۔

ادریس مجھے باہر معمار کے پاس لے گیا۔ معمار سے میرا تعارف کروایا۔ پھر مجھے ایک نقشہ دکھایا جو ایک بہت خوبصورت کوٹھی کا نقشہ تھا۔ ادریس نے مجھے بتایا کہ وہ اس نقشے کے مطابق اپنا مکان تعمیر کر رہے ہیں۔ ادریس نے وہ سب کچھ مجھے دکھایا جو وہ بنا چکے تھے اور اس کے متعلق بھی بتایا جو ابھی بنانے والے تھے۔ اس دوران میرے دل میں خیال آیا کہ ضرور مجھے آج سے ہی کام کرنا پڑے گا لیکن میں بچ گیا۔ اُس روز میں مہمان تھا اس لیے سارا دن مہمان بن کر گزار دیا۔ مجھ سے کوئی کام نہ لیا گیا اور آخر شام ہو گئی۔

رات کے کھانے میں میٹھے چاول اور میٹھی کھیر اضافی ڈش کے طور پر پیش کیے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میرا بستر بیٹھک میں بچھا دیا گیا۔ رات کو سونے سے پہلے میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ البتہ صبح کچھ اور ہوا۔ میرا خیال تھا جب صبح ہو گی تو مجھے سب سے پہلے وہ پرانے کپڑے پہننا پڑیں گے جو امی جان نے میرے بیگ میں رکھے تھے اور کہا تھا ماموں جان کے گھر میں کام کرتے وقت پہن لینا اور پھر اُس کے بعد سارا دن ادریس کے ساتھ معمار کو اینٹیں، ریت، سیمنٹ وغیرہ پکڑاتے گزر جائے گا۔

لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ مکان تعمیر کرنے کے ساتھ ساتھ میری زندگی میں اور بھی زبردست چکر آنے والے ہیں جو اس نفسیات دان بننے کے خواہش مند کو گھما کر رکھ دیں گے۔

جب صبح ہوئی تو میں نے واقعی اپنے بیگ سے پرانے کپڑے نکال کر پہن لیے۔ معمار اینٹیں لگانے کے لیے آ گیا۔ کام شروع ہوا تو ماموں جان نے مجھے اور ادریس کو معمار کے حوالے کیا اور خود اپنے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

ماموں جان کے گھر کے ساتھ ایک چھوٹی سی گلی تھی جو مغرب سے مشرق کی طرف بنی ہوئی تھی۔ ان کے گھر کا دروازہ شمال کی طرف کھلتا تھا۔ اُس روز جس کمرے کی ہم دیوار بنانے والے تھے وہ مشرق کی طرف تھی۔ یہ دیوار میرے آنے سے پہلے آدھی بن چکی تھی۔ ماموں جان کے گھر میں دو کمرے شمال کی جانب پہلے سے بنے ہوئے تھے۔ دو کمرے اور ایک بیٹھک مغرب کی طرف بھی بنے ہوئے تھے۔ بیٹھک کا دروازہ باہر گلی میں بھی کھلتا اور ایک گھر کے اندر بھی تھا۔ مشرق کی طرف جگہ خالی تھی۔ اب وہاں بھی دو بڑے بڑے کمرے بن رہے تھے جن کی دیواریں بنائی جا رہی تھیں۔ درمیان میں جو جگہ بچتی تھی اُس سمیت تمام کمروں کی چھتیں اُتار کر لینٹر پڑنے والا تھا۔

معمار نے لمبے لمبے بانس دیوار کے ساتھ باندھ کر ہم سے تختے اُوپر رکھوائے۔ پھر معمار تختوں کے اُوپر چڑھ گیا۔ مجھے بھی اپنی مدد کے لیے اُوپر تختوں پر بلا لیا۔ کبھی ادریس نیچے

سے اینٹیں اُوپر پھینکتا تو میں پکڑ کر تختے پر رکھ دیتا۔ کبھی اور ریس تعمیر میں ریت سیمنٹ مکس کیا ہوا ڈالتا اور نیچے سے مجھے پکڑا دیتا۔ میں پکڑ کر معمار کے پاس تختے پر رکھ دیتا اور معمار اینٹیں لگانا شروع کر دیتا۔ ایسے ہی یہ سلسلہ جاری رہنے لگا..... اور

میں ایک گھنٹہ تک تو بڑی توجہ سے اور دل جوئی سے کام کرتا رہا لیکن بعد میں جب میں اپنے کام سے تھوڑا اُکتا سا گیا تو میں نے تختوں پر کھڑے ہو کر اپنے ماموں جان کے مکان کے اردگرد نظر دوڑائی۔ اچانک میری نظر مشرق کی طرف سامنے والے گھر میں پڑی جس گھر کا صحن، برآمدہ، سیڑھیاں اور کمرے ان تختوں سے بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔

میں نے سامنے والے گھر کے برآمدے میں ایک لڑکی کو دیکھا جو کمرے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اُس نے دونوں طرف اپنے ہاتھ کی تلیاں دیوار سے لگائی ہوئی تھیں۔ اُس کا سر بھی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اُس کے چہرے پر اور کندھوں پر بکھرے پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دیکھنے میں وہ مجھے بہت ہی غمزدہ لگ رہی تھی۔

جب میری نظریں اس لڑکی کے چہرے پر پڑیں تو اچانک اُس نے اپنی آنکھیں کھول لیں۔ فوراً دیوار سے دور ہٹی اور مسکراتی ہوئی اپنے بال سنوارنے لگی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک گھنٹہ سے اسی انتظار میں تھی کہ میں کب اُس کی طرف دیکھتا ہوں لیکن میں نے جھٹ سے اپنی نظریں اُس لڑکی سے دور کر لیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ کسی دوسرے کے گھر میں ایسے چوری چوری نظریں ڈالنا بری بات ہے۔ میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا جیسے میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔

تھوڑی دیر بعد میری نظر معمار پر پڑی۔ وہ مسکراتے ہوئے اینٹیں لگا رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید اُسے کوئی اپنی پرانی بات یاد آ گئی تھی جسے یاد کر کے وہ مسکرا رہا ہو اس لیے اُسے دیکھتے ہوئے میں بھی مسکرا دیا اور اُسے اینٹیں پکڑانے لگ گیا۔

معمار سے آنکھ بچا کر تھوڑی دیر بعد میں نے دوبارہ سامنے والے گھر کی طرف دیکھا۔ دوبارہ اُس لڑکی کی طرف دیکھنے پر پھر مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ لڑکی میری طرف ہی دیکھے جا رہی تھی۔ کیونکہ جونہی میں نے اس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ وہ پچھلی ساری اُداسی بھول چکی تھی۔ بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے اپنے بازو پھیلائے ہوا میں چاروں طرف گھومتی ہوئی اپنی زلفیں بکھیر دیں۔ پھر اچانک میری طرف چہرہ کر کے رک گئی۔ اپنا دائیاں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھا اور اشارے سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنے بالوں میں پھیرتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سے اُس کے سلام کا جواب دے دیا۔

شاید اس لڑکی پر میری نظر جانے کی وجہ سے معمار نے کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔ وہ بڑی دل جوئی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے دوبارہ جھوٹی مسکراہٹ سے معمار کی طرف دیکھ کر پھر اس بات کو نظر انداز کر دیا اور ہم دوبارہ کام کرنے لگ گئے۔

ابھی تک میری توجہ اس لڑکی کے رویے اور کردار کی طرف تھی۔ اس کی ہر حرکت میرے شعور میں تھی۔ میں بار بار معمار سے آنکھ بچا کر اُس لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ میں جس کا نام تک بھی نہیں جانتا تھا اس نے مجھے عجب کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے تو وہ اُداس تھی لیکن جونہی میں نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بہت زیادہ خوش ہو گئی اور اُس نے مجھے سلام کیا۔ اک انجانی لڑکی نے مجھے دیکھتے ہی ایسا کیوں کیا۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی جلدی سے ایک کمرے کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اُس نے ہلکا سبز رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بڑی تیزی سے چلتی ہوئی سامنے مشرق کی طرف اپنے چھت کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ پھر سیڑھیوں کے درمیان میں پہنچ کر رک گئی۔ مسکراتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے میری طرف دیکھا۔ مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور اپنے بالوں کو سنوارتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگی۔ میں نے جھٹ سے اپنے دل و دماغ کو بیدار کیا اور جھوٹی مسکراہٹ سے دوبارہ اس کے اشارے کا جواب دیا۔

وہ لڑکی حیران تو مجھے پہلی بھی کر چکی تھی لیکن اس کے بعد شاید اُس کا ارادہ مجھے پاگل کرنے کا تھا۔ سیڑھیوں سے اترنے کے بعد میں نے اس کا ایک نیا روپ دیکھا۔

معمار سے آنکھ بچا کر جونہی میں نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا تو اُس نے فوراً مجھے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے۔ پھر اپنے ہاتھوں سے اپنے سر کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پاگلوں کی طرح زور زور سے اپنے سر پر دونوں طرف، دونوں ہاتھوں سے تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔ پھر تھپڑ مارتے مارتے نیچے بیٹھنے لگی۔ نیچے بیٹھ کر اس نے اپنے سر کو مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے اُس کا سر پھٹنے والا ہو۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے سر کو پکڑ کر زمین سے لگا دیا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے رُک گئی۔ پھر اچانک کھڑی ہو گئی۔ بھاگتی ہوئی سامنے ایک پانی کے نلکے کے پاس گئی اور اپنے سر پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ ہلکا سبز رنگ کا سوٹ بھی پانی سے بھیگ گیا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر میں بہت زیادہ حیران ہو چکا تھا اور اپنے دماغ کی کھڑکیوں کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکی ایسا کیوں کر رہی تھی۔

تقریباً دس منٹ تک وہ اپنے سر میں نلکے کا پانی ڈالتی رہی۔ پھر وہ نلکے سے دور ہو گئی اور اپنے بال پکڑ کر اپنے سر پر اکٹھے کر دیے۔ پھر ایک سرخ پٹی سے بالوں کو باندھ دیا۔ شیشے کے گلاس میں پانی ڈالا اور مجھے دکھاتے ہوئے سفید رنگ کی ٹکیاں اپنے منہ میں ڈالیں اور پھر پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ ٹکیاں کھانے کے بعد وہ بالکل ٹھیک دکھائی دینے لگی۔ جب اس نے خود کو پہلے سے بہتر محسوس کیا تو وہ دوبارہ اسی کمرے میں چلی گئی جس میں پہلے گئی تھی۔ میں تختوں پر بیٹھا حیرانی سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ دوبارہ کمرے سے باہر نکلی تو اس نے پیلے رنگ کے بڑے بڑے پھولوں والا ایک نیا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر سفید رنگ کے شیشوں والی عینک لگائی ہوئی تھی۔ اپنے ہاتھوں میں ایک ڈائجسٹ پکڑا ہوا تھا۔ وہ بڑے سنجیدہ موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ باہر نکل کر وہ سامنے دھوپ میں بیٹھ گئی اور ڈائجسٹ پڑھنے لگی۔

شاید اُسے ڈائجسٹ کی کوئی کہانی بہت زیادہ پسند آئی تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے اچانک رُک گئی۔ اپنی آنکھوں سے سفید شیشوں والی عینک اُتار کر دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے ماتھے پر رکھ کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر اپنے سر کو دونوں طرف جھٹکا دیتے ہوئے مسکرائی اور دوبارہ عینک آنکھوں پر لگا کر ڈائجسٹ پڑھنے لگ گئی۔

میں اُس لڑکی کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور مجھے دیکھ کر معمار مسکرا رہا تھا لیکن ابھی تک میری عقل میں کوئی بات نہیں پڑ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے دوسری دیوار بنانا شروع کر دی۔ میں اور معمار دوبارہ تختوں پر چڑھ گئے۔ تختوں پر چڑھتے ہی میری نظر سامنے مشرق کی طرف گھر پر پڑی جہاں ایک تنہا لڑکی مختلف ''سچے یا جھوٹے تھے'' کردار دکھا رہی تھی۔

اس مرتبہ جب میں نے اُسے دیکھا تو اُس نے مکمل سفید رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گلاب کا سرخ پھول تھا۔ اُس نے اپنی محبت کا اظہار کیا اور اشارے سے مجھے سرخ گلاب کا پھول پکڑنے کی دعوت دی۔ میں اچانک پریشان ہو گیا اور اُس کی محبت کو قبول نہ کیا۔ اشارے سے اپنے سر کو نہیں میں ہلا دیا۔ میرا انکار دیکھ کر اُسے مجھ پر بہت زیادہ غصہ آیا۔ اس نے فوراً گلاب کے سرخ پھول کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مسل کر زمین پر پھینک دیا۔ گلاب کے پھول کی پتیاں زمین پر دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔

اتنے میں ادریس نے مجھے اور معمار کو تختوں پر ہی چائے کا ایک ایک کپ پکڑا دیا۔ میں چائے کا کپ پکڑ کر ساتھ والی دیوار پر بیٹھ گیا اور پھر چائے پیتے ہوئے اشارے سے اُس لڑکی کو چائے پینے کی دعوت دی۔ شاید میرے انکار کا غصہ ابھی تک اترا نہیں تھا۔ وہ جلدی سے ایک نئے کمرے میں چلی گئی اور فوراً واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں اس بار آدھی درجن چینی کے کپ تھے۔ پتا نہیں اُسے کیا ہوا اُس نے غصے سے اور زور زور سے برآمدے کے فرش پر وہ کپ ایک ایک کر کے توڑ دیے۔ کپ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ کپ توڑنے کے بعد وہ اپنے سر کو اپنے ہاتھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کبھی اِدھر جانے لگی کبھی اُدھر جانے لگی۔ میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس لڑکی کے بارے میں صبح سے یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں مختلف خیال اور سوال و جواب گھوم رہے تھے۔ میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ مجھے ابھی اُس کے متعلق بہت کچھ جاننا تھا۔ جو خیال اور سوال و جواب میں سوچ رہا تھا وہ یہ تھے کہ واقعی اسے دورہ پڑا۔ جو اس نے نکیاں کھائیں وہ اصلی تھیں، وہ میرے دیکھنے سے پہلے اُداس تھی اور میرے دیکھنے کے بعد ہی خوش ہوئی۔ کبھی میں سوچتا وہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی۔ کہیں میرا خوبصورت چہرہ دیکھ کر واقعی اسے مجھ سے پیار تو نہیں ہو گیا۔ کہیں وہ ذہنی طور پر بیمار تو نہیں۔ میں وہ سب کچھ سوچ رہا تھا جو وہ کردار ادا کر کے میری توجہ حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ اتنی جلدی یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ چالاک تھی تو مجھے بھی اُس کے کردار سے اُس کے دل کی گہرائی تک پہنچنا تھا۔ پھر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے میں نے ایسا ہی کیا اور آنے والے وقت پر اس فیصلے کو چھوڑ دیا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ دو چھوٹے لڑکے اُس کے گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے سکول کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ لڑکی بہت زیادہ خوش ہوئی اور ان دونوں کو پہلے والے کمرے میں لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اکیلی باہر نکلی۔ اُس نے سفید سوٹ پر گلابی رنگ کی چادر لی ہوئی تھی۔ اُسی چادر سے نقاب کیا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں چند کتابیں تھیں۔ شاید وہ کہیں پڑھنے کے لیے جا رہی تھی۔ اُس نے چلتے چلتے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا اور پھر گھر سے باہر نکل گئی۔ ان دونوں لڑکوں نے سکول کی وردیاں اُتار کر کوئی اور کپڑے پہن لیے اور صحن میں بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ یقیناً وہ دونوں لڑکے اس کے چھوٹے بھائی تھے۔

جب سے وہ لڑکی کہیں گئی ہوئی تھی وہ دونوں لڑکے اُسی جگہ بیٹھ کر پڑھتے رہے۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد وہ لڑکی دوبارہ واپس آئی۔ اتنے میں اُس کے ماں باپ بھی کھیتوں سے گھر واپس آ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ صبح سے وہ لڑکی گھر میں تنہا تھی لیکن اب ان کے گھر میں کافی رونق تھی۔ اُس نے بڑی توجہ سے اپنے گھر والوں کے لیے کھانا پکایا اور اپنے ماں باپ اور ان دونوں لڑکوں کو ''جو اُس کے چھوٹے بھائی تھے'' کھلایا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ جب سے اس کے گھر میں باقی افراد بھی آ گئے تھے اُس نے ایک مرتبہ بھی میری طرف نہ دیکھا اور بڑی توجہ سے اپنے گھر کے کاموں میں مصروف رہی۔

ہمارا بھی اُس روز کا کام ختم ہو چکا تھا۔ میں اور معمار تختوں سے نیچے اتر گئے۔ معمار اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور میں نے بھی نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر لیے۔

ادریس میرا ہم عمر تھا۔ اس لیے ہم دونوں میں بہت اچھی دوستی ہو گئی۔ رات کو میرا اور ادریس کا بستر بیٹھک میں بچھا دیا گیا۔ رات کو سونے سے پہلے میں اُس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ادریس سے اُس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ میرے الفاظ سن کر ادریس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی لطیفہ بول دیا ہو۔ خاموش ہو کر ادریس نے کہا۔ وہ لڑکی ہماری ہمسائی ہے۔ اس کا نام ایمن ہے۔ بہت ہی ذہین ہے۔ بی ایس سی کا امتحان پاس کر چکی ہے۔ اب ایم ایس سی میں داخلہ لیا ہوا ہے۔ سیکنڈ ٹائم ساتھ والے قصبے میں پڑھنے کے لیے جاتی ہے۔ اُس سے ذرا بچ کر رہنا بہت ہی چالاک ہے۔ اشاروں سے ہر ایک کو بے وقوف بناتی رہتی ہے۔

میں نے ادریس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے تو اس نے جواب دیا اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن آج تک ہمیں بھی سمجھ نہیں آئی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے لیکن ہمیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ وہ غلط لڑکی نہیں ہے۔

میں بہت ہی سیدھا سادہ انسان تھا۔ عشق و محبت کے دنیاوی جھنجھٹ سے تو مجھے پہلے بھی الرجی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ ایمن سے دوستی کر لی جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ میں اُس کے پاگل پن کی تہہ تک بھی پہنچ جاؤں گا اور یہ جان لوں گا کہ وہ کیوں ایسا کرتی ہے۔ کیونکہ میں بھی کسی بات کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا اور وہ لڑکی تو ویسے بھی میرے لیے عجیب رویے کی مالک تھی۔

اس کے بعد کئی روز تک کبھی اینٹیں لاتے ہوئے، کبھی بجری اُٹھاتے ہوئے، کبھی ریت پھینکتے ہوئے، کبھی چھتیں اُتارتے ہوئے، کئی مرتبہ وہ مجھ سے نظریں ملاتی رہی اور اشاروں سے باتیں کرتی رہی۔

ایک روز معمار چھٹی پر تھا۔ میں اور ادریس پرانے کمروں کی چھتیں اُتار رہے تھے۔ میری نظر ایمن پر پڑی۔ اُس نے کالے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر چھوٹے چھوٹے سفید رنگ کے ستارے لگے ہوئے تھے۔ وہ بہت زیادہ اُداس تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے دکھاتے ہوئے وہ ایک رومال سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ میں نے ادریس سے کہا ایمن کو دیکھو اُسے آج کیا ہوا ہے۔ ادریس نے جواب دیا بس تم دیکھتے جاؤ وہ آج کیا کرتی ہے۔ یقیناً وہ تھوڑی دیر بعد بالکل ٹھیک تھی۔ جلدی سے ایک

کمرے میں چلی گئی اور ایک مٹھائی کا ڈبہ اُٹھا لائی۔ مٹھائی کھاتے ہوئے اشارے سے اس نے مجھے بھی کھانے کی دعوت دی۔ جواب میں میں نے مٹی کا ایک ٹکڑا پکڑ کر اسے کھانے کی پیشکش کی۔ مٹی کا ٹکڑا دیکھ کر وہ خوب ہنسی۔

اُس روز پہلی مرتبہ میں نے خود اسے اشارہ کیا۔ اس سے اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر پوچھا۔ ایمن نے جلدی سے خوشی خوشی دیوار کی اوٹ میں نمبر لکھ کر میری طرف پھینک دیا۔ ادریس کے پاس ایک موبائل فون تھا میں نے فوراً ایمن کا دیا ہوا نمبر ملا دیا۔ اپنے ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر ایمن نے جلدی سے کمرے میں جا کر ریسیور اُٹھا لیا۔ میں نے سب سے پہلے ایمن کو سلام کیا اور پھر کہا ''ایمن! میں تم سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے سچ سچ جواب دینا۔''

ایمن نے کہا ''حبیب! تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں میرا نام کس نے بتایا ہے۔ پھر جو کہو گے سب سچ سچ بتاؤں گی۔''

ایمن نے بڑی حاضر دماغی سے جواب دیا۔ کیونکہ میں نے اس کا نام لیا تو جواب میں اس نے میرا نام لے لیا۔

میں نے کہا ''مجھے ادریس نے بتایا ہے لیکن تم بتاؤ تمہیں میرا نام کس نے بتایا ہے؟''

ایمن نے کہا ''مجھے میری ایک سہیلی نے بتایا ہے۔ خیر چھوڑو۔ بتاؤ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا ''ایمن یہ مجھے دکھاتے ہوئے گلاب کے پھول کو مسلنا، اپنے سر کو جھنجھوڑنا، کبھی خوشی سے ہوا میں اپنی زلفیں بکھیر دینا تو کبھی اُداسی میں اپنی آنکھوں میں آنسو لے آنا۔ کبھی پاگلوں کی طرح اپنے سر پہ تھپڑ مارنا، سر پہ پانی ڈالنا، کپ توڑنا اور کبھی اتنا سنجیدہ ہو جانا کہ تم نے کبھی مجھے دیکھا بھی نہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے اور تم یہ سب کچھ کیوں کرتی ہو۔ میں اچھی طرح تمہارے بارے میں جان گیا ہوں کہ تم بہت ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو لیکن پھر بھی ایسا کیوں۔ سچ سچ بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے۔''

میں نے بڑے سنجیدہ موڈ میں دل کی گہرائیوں سے سوال پوچھا۔

ایمن نے کہا ''حبیب! تم سچ سچ سننا چاہتے ہو۔ تو سنو...... مجھے کینسر ہے۔ نہ جانے کب میری زندگی ختم ہو جائے اور میں اس دنیا سے چلی جاؤں۔ میں دنیا کی ہر خوشی دیکھنا چاہتی ہوں۔ مرنے سے پہلے لیکن میری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ میں وہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتی جو مرا دل چاہتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمیں قید کر کے رکھنا چاہتا ہے۔ میں پڑھنا چاہتی تھی میں نے گھر والوں سے لڑ کر تعلیم حاصل کی لیکن اب میں اپنی تعلیم اور قابلیت کو عملی طور پر استعمال نہیں کر سکتی۔ میں سوچتی ہوں اگر میں ان پڑھ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ کم از کم ایسی پاگلوں سی حرکتیں تو نہ کرتی۔''

میں نے کہا ''ایمن! اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔''

ایمن نے کہا ''ہاں کہو......''

میں نے کہا ''تم مجھے اپنا دوست بنا لو۔ شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔''

ایمن نے کہا ''ٹھیک ہے۔ آج سے تم میرے بہترین دوست ہو۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔''

ایمن نے کہا ''خدا حافظ۔''

ٹیلی فون سے ہماری باتیں ختم ہوئیں تو تھوڑی دیر بعد ایمن کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ بالکل بدل چکی تھی۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شاید اُس روز مجھے اپنی بیماری کے بارے میں بتانے کی وجہ سے ایمن کو کچھ زیادہ ہی اپنی بیماری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ماتھے پر سرخ کپڑے کی ایک پٹی باندھ لی۔ ہاتھ میں ایک کپ پکڑ لیا اور مجھے دکھاتے ہوئے سفید رنگ کی ٹکیاں کھانے لگی۔ ٹکیاں کھانے کے بعد وہ کمرے میں بستر پر لیٹنے کی بجائے سارا دن میرے سامنے مجھے دکھاتی رہی کہ کبھی اسے چکر آ رہے ہیں، کبھی دل ڈوبا جا رہا ہے اور کبھی کبھی تو بے ہوش ہونے تک چلی جاتی تھی۔ البتہ اس کی بیماری کا راز اُس وقت ہی فاش ہو گیا جب اُس کے بھائی سکول سے گھر واپس آئے تھے۔ اُس نے سرخ پٹی اُتار کر پھینک دی اور بالکل ٹھیک ہو گئی۔ پھر سفید کپڑوں پر گلابی چادر کا نقاب کیا اور کتابیں پکڑ کر پڑھنے کے لیے چلی گئی۔

اُس کی بیماری کا اتنا بڑا جھوٹ میں سمجھ نہ سکا۔ اُس نے مجھ سے کیوں جھوٹ بولا۔ جتنے بھی الفاظ اُس نے ٹیلی فون میں مجھ سے بولے تھے اُن میں کتنا جھوٹ تھا اور کتنا سچ تھا میں کچھ بھی کہہ نہیں سکتا۔

ایمن مجھے کس نظر سے دیکھتی تھی اور میں اُسے کس نظریے سے دیکھتا تھا اس بات کا پتہ نہ اُسے چل سکا اور نہ مجھے۔ کیونکہ وہ جب بھی میرے سامنے آتی تو کبھی روتی ہوئی آتی تھی، کبھی پھولوں کی طرح مسکراتی ہوئی آتی تھی۔ کبھی اتنی سنجیدہ ہوتی تھی کہ اُس سے خوف آتا تھا۔ کبھی بچوں کی طرح شرارتیں کرتی تھیں تو کبھی بڑوں کی طرح ڈانٹتی تھی۔ کیوں ایسا کرتی تھی یہ بات زیادہ بہتر اُس کا دل جانتا تھا۔ البتہ میں اُس کے سامنے صرف اس لیے آتا تھا، صرف اس لیے اس کے ہر اشارے کا مسکراہٹ سے جواب دیتا تھا کیونکہ میں اُسے پرکھنا چاہتا تھا۔ اُس کے اس رویے کو جاننا چاہتا تھا اُس کے کردار کی حقیقت کو پہچاننا چاہتا تھا اور اس بات کو سمجھنا چاہتا تھا کہ وہ زندگی سے کیا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ماموں جان کے گھر میں آئے ہوئے مجھے پندرہ روز گزر چکے تھے۔ میرے کالج کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ مجھے جلد از جلد واپس جانا تھا۔ میں پندرہ روز تک ایمن کے کردار سے اُس کو پرکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اُس سے متعلق سب کچھ تو نہیں البتہ بہت کچھ جان لیا اور اس کی حقیقت کچھ اس طرح تھی۔

ایمن کا تعلق معاشرے کے ایک ایسے گھرانے سے تھا جہاں پر لڑکیوں پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ ایمن اُن لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ان پابندیوں میں رہنا پسند کرتی تھیں۔ وہ پڑھ لکھ کر معاشرے میں ایک اہم کردار ادا کرنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ہنستی تھی تو کبھی روتی تھی اور ہر شخص میں اپنا آئیڈیل تلاش کر رہی تھی۔ جو اس کے معیار پر پورا اُتر سکے۔ وہ اس بات کی پہچان کروانا چاہتی تھی کہ مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک ایسا ساتھی تلاش کر رہی تھی جو اُسے دیہات میں قید کر کے نہ رکھے۔

ایمن ہوا میں اُڑتے شبنم کے قطروں کی طرح جن پر سورج کی کرنیں پڑ رہی ہوں۔ اُڑتے ہوئے چمکنا چاہتی تھی۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتی تھی کہ دنیا میں کہیں ایمن نام کی لڑکی بھی رہتی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اسے آرٹسٹوں کی طرح آگے پیچھے لائن لگائے کھڑے ہو کر اُس سے آٹوگراف لیں۔ وہ پہاڑوں سے بہنے والے پانی کی طرح جو دریاؤں میں، نہروں میں، کھالوں میں اور کھیتوں میں اُگنے والے پیڑوں تک پہنچتا ہے اس طرح وہ بھی دنیا کے کونے کونے میں پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ پرستان کی پریوں کی طرح ہاتھ میں چمکتا ستارہ پکڑے ہوا میں اُڑتے ہوئے پرستان کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی زندگی خوشی سے گھومتے، سیر کرتے، بھاگتے اُچھلتے، خوشی سے گاتے، ہنستے، ستاتے اور کتابیں پڑھتے اپنے آئیڈیل کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی لیکن ایسے آئیڈیل کے ساتھ جو اس کے معیار پر پورا اُتر سکے اور اُس کی چالاکی کے ہر وار کو روک سکے اور اُس کی خواہشات کے مطابق اُس کی قابلیت کو پرکھنے کا پورا پورا موقع دے سکے۔

افسانہ

یادوں کی دُھند

دستگیر شہزاد

دستگیر شہزاد کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے۔ ادب میں انہوں نے مضامین، شاعری اور افسانے لکھ کر اپنی شناخت بنائی ہے۔ اُن کا اندازِ تحریر اُن کی شخصیت کی طرح بالکل منفرد اور نیا ہے۔ وہ اپنے اندر ایک سیلانی روح رکھتے ہیں۔ اُن کا افسانہ علامتی اور تجریدی ہے جو کہ آج کے معاشرتی مسائل کا عکاس اور نمائندہ ہے۔

جب رات اُترتی ہے اور میری چاہت کا پل صراط پرانے بوسیدہ پتھروں اور خستہ دیواروں کے اس پار عشق پیچاں کی بیلوں میں کہیں چُھپ جاتا ہے اور پل صراط کے نیچے بے حد گہری ندی یاد کی دُھند میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ بہتی ہے اور کسی خوبصورت سے جسم پر ریشمی لباس کی سرسراہٹ کا احساس جگاتی ہے تو ایک آواز میرا تعاقب کرتی ہے۔ مجھے مسلسل صدا دیتی ہے اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھول دیتا ہوں اور اپنی ادھ کھلی آنکھوں کو بند کر کے تصور کی نگاہیں سامنے والے مکانوں کی کھلی کھڑکیوں میں گاڑ دیتا ہوں۔ ان کھلی کھڑکیوں کی عجیب عجیب سی کہانیاں میرے دل کے نہاں خانوں میں قید ہیں۔ میں نے اپنے ذہن کے دروازے پر ایک بڑا سا تالا لگا دیا ہے۔ کبھی کبھی جب میری سوچوں کا دم گھٹنے لگتا ہے تو میں اس دروازے کو چند لمحوں کے لیے وا کر دیتا ہوں اور اس سے سب سے پہلے عرفہ کی خوابگاہ کی کہانی قریب سرکنے لگتی ہے۔

میں جہاں رہتا ہوں وہ ایک بڑی آباد بستی ہے اور بستی میں کئی محلے، کئی سڑکیں اور کئی گلیاں ہیں۔ ایک لنک روڈ بھی ہے۔ عرفہ اسی لنک روڈ پر واقع ایک مکان میں رہتی ہے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھول دی ہے۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں ہیں اور اپنے تخیل کی نگاہوں سے عرفہ کی خواب گاہ میں جھانک رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں عرفہ کا چاندنی میں نہایا ہوا وجود کسی مرد کے سامنے بکھرا ہوا ہے اور وہ مرد اسے ایسی پیاسی نظروں سے دیکھ رہا ہے جیسے وہ لڑکی نہ ہو کوئی نشے کی بوتل ہو۔ جس کا کارک ابھی ابھی کھولا گیا ہو اور جس کے جام جسم میں جذب کرنے کے بعد ہونٹوں کی پیاس اور شریر کی جستجو اور بڑھ گئی ہو۔

میں اس مرد سے واقف ہوں۔ اس میں میرا وجود سمٹا ہوا ہے۔ تب یہ بستی نہ تھی۔ یہ محلے نہ تھے اور نہ گلیاں اور سڑکیں ایک بڑا ویرانہ تھا اور اس ویرانے میں ایک دن جب پو پھٹ رہی تھی اور ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور اس ویرانے کے چاروں سمت ایک بڑی لطیف سی سرسراہٹ جاگ رہی تھی۔ دفعتاً بادلوں نے ویرانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے بادل گرجے، خوب گرجے اور برسنے سے پہلے ہی ان کی اوٹ سے بجلی برگد کے بوڑھے درخت پر جا گری۔ برگد کے سینے میں ایک بڑا شگاف ہو گیا اور اس شگاف میں سے ایک عورت پھوٹ پڑی۔ وہ بالکل بے لباس تھی لیکن اس نے اپنے لمبے بالوں سے مرمریں جسم کو لپیٹ رکھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہی رہی جہاں جہاں اس کے قدم پڑے وہاں پھول کھلے، کھلتے ہی رہے اور اب یہ ویرانہ ایک خوشنما سرسبز جنگل میں بدل گیا۔ تو وہ ایک تاریک غار کے اندر چلی گئی۔ وہ وہاں عبادت کرتی رہی اور اُسے وہاں نروان مل گیا اور جب بادل گرجے اور گرج کر برسنے لگے تو وہ برستی رات کے اندھیروں میں غار سے باہر نکل آئی لیکن اب وہ تنہا نہیں تھی۔ ایک ننھا منا بچہ بار بار اپنا منہ اس کے سینے پر مار رہا تھا جیسے وہ بے حد پیاسا ہو۔ اس کے منہ پر دودھ کی چھینٹیں تھیں۔ عرفہ مسکرا رہی ہے۔ چھوٹے قد کا بے حد معمولی آدمی بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔ عرفہ سرخ کانچ کا گلاس اس کی طرف بڑھا رہی ہے۔ گلاس سرخ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر سرخ مئے ناب بھرا ہے۔ اس آدمی کے رُوپ میں میرا ماضی لوٹ آیا ہے۔ میں بھی اپنے ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا ہوں۔ مجھے ایک بوند دودھ کی تلاش ہے۔ کاش عرفہ ایک بار پھر تاریک غار میں چلی جاتی۔ کاش اسے ایک بار پھر نروان مل جاتا تو میرا بچپن ایک بار اور

لوٹ آتا اور میں عرفہ کے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیتا لیکن یہ ممکن نہیں۔ چھوٹے قد کا یہ آدمی شاید کچھ زیادہ ہی نشے میں ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور وہ کمرے کے ایک کونے میں فرش پر بیٹھ گیا ہے۔

عرفہ نے اپنی بانہیں پھیلا دی ہیں اور اب بانہوں میں میری جوانی سمٹ کر آ گئی ہے۔ ہاں اب اس کی بانہوں کی گرفت میں جو ہنستا مسکراتا مرد عرفہ کے ہونٹوں کی لالی چوس رہا ہے میں اسے جانتا ہوں۔ یہ میں ہوں۔ نہیں میں نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے۔ یہ میرا تصور ہے۔ عرفہ کی بانہوں کی گرفت سخت ہو گئی ہے۔ نہیں یہ میرا تصور نہیں بلکہ میں ہوں اور مجھے لگ رہا ہے جیسے میں عرفہ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا کر لہرا رہا ہوں۔ اسے اس لذت سے آشنا کر رہا ہوں جو جوانی کی دین ہے۔ اس کی بھیگی بھیگی دھڑکنوں سے ایک انجان سی کہانی دہرا رہا ہوں اور حال کے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کے نشان میں نکلنے کی تیاری کر رہا ہوں۔

چھوٹے قد کا آدمی اب بھی سویا ہوا ہے۔ عرفہ نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا ہے اور مجھے لگ رہا ہے جیسے ابھی ابھی میرا ماضی اسی کھڑکی سے کوسوں دور پھینک دیا گیا ہے۔ اب عرفہ مسکراتے ہوئے مرد کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی ہے۔ شاید اس غار کی تلاش میں جہاں اسے نروان ملا تھا لیکن اسے نروان مل بھی گیا تو کیا میرا ماضی میرا بچپن لوٹ کر آئے گا۔ اُف مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں یہ سب دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ سب حقیقت ہے۔ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میرے ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں۔ میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اپنے سر پر پھیر رہا ہوں۔ حال کے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کا وقت قریب آ گیا ہے۔ میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میری آنکھوں کی بینائی

کمزور ہو چکی ہے۔ یہ میں نہیں ہوں یہ میرا مستقبل ہے۔ ہاں مجھے اپنا مستقبل اس تیسرے آدمی کے رُوپ میں نظر آ رہا ہے۔ جو عرفہ کے کمرے کی کھڑکی کا سہارا ہے حسرت بھری نظروں سے بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسے بھی عرفہ کا انتظار ہے۔ وہ کانپتے لرزتے ہاتھوں سے بار بار اپنے چہرے پر بکھرے ہوئے پسینے کو پونچھ رہا ہے۔

عرفہ کمرے میں لوٹ آئی ہے۔ وہ اب تنہا ہے۔ وہ حال کو کہیں چھوڑ آئی ہے۔ وہ ٹکٹکی لگائے بوڑھے آدمی کی جانب دیکھ رہی ہے۔ وہ شاید بوڑھے کی صورت میں اپنے خالق کو تلاش کر رہی ہے لیکن بوڑھے کی آنکھوں میں ہوس ہے۔ جو تیز ہوتی جا رہی ہے اور اب ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ آواز عرفہ کی ہے۔ بوڑھے کھوسٹ یہاں آ ؤ۔ اب بھی تیرا جی نہیں بھرا۔ جب تو چھوٹا تھا میں نے تجھے اپنے تھنوں سے دودھ پلایا۔ جب تو نے جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھا میں نے تیری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دی اور اب...... اب موت تیرے قریب ہے اور تو......تو...... قریب آ......!

بوڑھا یا میرا مستقبل آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اپنی بوڑھی آنکھوں کی ہوس کو عرفہ کے جوان اور نرم گرم سینے میں گم کر دینا چاہتا ہے لیکن وہ کانپ رہا ہے۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کا سہارا لیا ہے۔ شاید اس کے پاؤں زندگی کی طویل مسافت سے تھک چکے ہیں۔ عرفہ کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ وہی زہریلی مسکراہٹ جو موت کا پیغام دیتی ہے۔ میں اپنے مستقبل کی اس قدر بھیانک موت نہیں دیکھنا چاہتا لیکن اس بوڑھی ہوس کا کیا کروں جو ہر سے آنکھوں میں ناچتی رہتی ہے۔ اس آگ کو کیا کروں جو ٹھنڈی تو ہو چکی ہے لیکن میرے وجود میں سلگ رہی ہے۔

عرفہ اب وحشیانہ قہقہے لگا رہی ہے۔ میں نے اپنے ذہن کا نیم وا دروازہ بند کر لیا ہے۔ میں اب دور کھڑکیوں کے اندر جھانکنا نہیں چاہتا۔ میں اب کبھی بھی یہ دروازہ نہیں کھولوں گا۔ کاش میری سوچوں کا دم گھٹ جاتا اور اس گھٹن میں میرا ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو کر ایک دوسرے میں کھو کر پل صراط کو پار کرتے کرتے اس گہری ندی میں گر کر ڈوب جائے جو یادوں کی دھند میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ خرامی سے بہتی ہے۔

ماہنامہ حرفِ جعفر فیصل آباد

مدیر: ڈاکٹر جعفر حسن مبارک — زیر اہتمام: مثال پبلشرز، فیصل آباد

قیمت: -/50روپے — تبصرہ نگار: آغا تنویر

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک نامور شاعر، سفرنامہ نگار، افسانہ نویس اور نہایت فعال سماجی اور فلاحی شخصیت ہیں۔ اُن کی زیر ادارت شائع ہونے والا ماہنامہ ''حرفِ جعفر'' اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ بسلسلہ منٹو صدی کے عنوان سے اس شمارے میں سعادت حسن منٹو کے حوالے سے لکھے گئے مضامین شامل ہیں جن میں احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، کرشن چندر، امرتا پریتم، صفدر میر، شورش کاشمیری، اے حمید، حبیب جالب، ڈاکٹر سلیم اختر کے مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

سہ ماہی ادب و ثقافت امریکہ

مدیران: شکیل سروش/ شیخ اعجاز

قیمت: -/200روپے — تبصرہ نگار: آغا تنویر

امریکہ میں مقیم معروف شاعر شکیل سروش کی زیر ادارت شائع ہونے والے جریدے ادب و ثقافت کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے جسے نامور شاعر بیدل حیدری (مرحوم) کی یاد میں شائع کیا گیا ہے اور اُن کے نام سے منسوب ہے۔ شکیل سروش بیدل حیدری کے شاگرد بھی ہیں۔ سرورق انتہائی دیدہ زیب ہے۔ حمد و نعت اور شعراء کے کلام کے علاوہ مضامین اور افسانے بھی شامل ہیں۔ حسن عباسی کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کا مضمون ''محبتوں کے استعاراتی نظام کا شاعر'' طارق ہاشمی اور سیّد وقار کے مضامین اور افسانوں میں محمد حمید شاہد کا افسانہ ''تھوتھن بھنورا''، جعفر حسن مبارک کا ''ہجرت کا بہی کھاتہ'' اسد محمود خاں کا ''جواز'' شامل ہیں۔

سحر و شام میں تنظیم کہاں ہوتی ہے
خواہشِ صبح کی تجسیم کہاں ہوتی ہے
لوٹ لے جاتا ہے بس چلتا ہے جس کا جتنا
روشنی شہر میں تقسیم کہاں ہوتی ہے
ان محلوں میں جہاں ہم نے گزاری ہے حیات
مدرسے ہوتے ہیں، تعلیم کہاں ہوتی ہے
شہریاروں نے اُجاڑا ہو جسے ہاتھوں سے
پھر سے آباد وہ اقلیم کہاں ہوتی ہے
تیرتے ہیں جو غلاموں کی جھکی آنکھوں میں
ان سوالات کی تفہیم کہاں ہوتی ہے
جس کا اعزاز ترے در کی گدائی ہو اُسے
عمر بھر خوئے زر و سیم کہاں ہوتی ہے
ہم غریبوں کی جبیں پر کسی جابر کے حضور
تہمتِ سجدۂ تسلیم کہاں ہوتی ہے

سرور ارمان/لاہور

جان کاشمیری /گوجرانوالہ

پوچھ لو گردشِ دوراں کے ارادے ہم سے   لوحِ محفوظ کے لکھے پہ نظر رکھتے ہیں

جان کاشمیری ہمارے عہد کے ایک معتبر شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی شعروادب کے نام وقف کر رکھی ہے۔ دشت ادب کی سیاحی میں ان کی عمر گزری ہے۔ بہت سے شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ سہ ماہی ''قرطاس'' گوجرانوالہ کے مدیر ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہمیں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں جنہیں وہ بہت احسن طریقے سے نبھاتے ہیں۔ وہ غزل لکھتے ہوئے کسی اُکتاہٹ یا تھکن کا شکار نہیں ہوتے۔ اُن کی غزل غمِ جاناں اور غمِ زمانہ کی روداد ہے۔ (ارژنگ)

کہاں منزل ملے ہمدردیاں تبدیل کرنے سے
بھٹک جاتے ہیں راہی کارواں تبدیل کرنے سے
یہ رزمِ زندگانی سے مفر کی ایک صورت ہے
مسائل حل نہیں ہوتے مکاں تبدیل کرنے سے
شکاری کی حریص آنکھیں یہاں بھی آن پہنچی ہیں
پرندے خوش نہیں ہیں گلستاں تبدیل کرنے سے
مقدر میں جو لکھے ہوں حوادث ہو کے رہتے ہیں
اماں ملتی نہیں جائے اماں تبدیل کرنے سے
زباں سے حرف جو نکلا وہ حرفِ معتبر ٹھہرا
مجھے تو موت بہتر ہے بیاں تبدیل کرنے سے
اُسے ہر حال میں شب بھر ضیاء تقسیم کرنی ہے
ملے گا کیا؟ مدارِ کہکشاں تبدیل کرنے سے
نیا انداز ہے یہ آدمی کی خود فریبی کا
کبھی بڑھتا نہیں قد پگڑیاں تبدیل کرنے سے
فقط اِک پل کو سطحِ آب پر لرزش سی ہوتی ہے
ٹھہرتا کب ہے دریا کشتیاں تبدیل کرنے سے
سرک جاتی ہے چاہت رفتہ رفتہ اپنے محور سے
بدل جاتا ہے دل دلچسپیاں تبدیل کرنے سے
زمانے کو وفا کے سب کے سب کردار ازبر ہیں
پڑے گا فرق کیا، اب داستاں تبدیل کرنے سے
ہدف بدلا، نظر بدلی، وفا کی سلطنت لرزی
لٹا دل کا اثاثہ رازداں تبدیل کرنے سے
ستم گر ایک جھٹکے میں پروں کا کام کر دینا
کہ مر جاتے ہیں پنچھی قینچیاں تبدیل کرنے سے
تونگر کرتی ہے انسان کو احساس کی دولت
کشادہ دل نہیں ہوتا مکاں تبدیل کرنے سے
کبھی ٹوٹا نہیں ہے خودبخود الفاظ کا رشتہ
زباں تبدیل ہوتی ہے، زباں تبدیل کرنے سے
وہی موسم، وہی گھاتیں، وہی دستورِ قزاقی
ملا کیا جان ہم کو باغباں تبدیل کرنے سے

اُسے اپنا سمجھ، مہمان چاہے دشمنوں کا ہو
نظر میں پھول رکھ گلدان چاہے دشمنوں کا ہو
عمل کرنا نہ کرنا یہ تمہاری دسترس میں ہے
مگر سن غور سے، فرمان چاہے دشمنوں کا ہو
یہ آدابِ مسافت پر سراسر ایک دھبہ ہے
نہ رستے سے اُٹھا، سامان چاہے دشمنوں کا ہو
زمیں پر ہل چلانا خدمت انسانیت ٹھہرا
اُسے تکریم دے، دہقان چاہے دشمنوں کا ہو
حوادث رفتہ رفتہ حسن انساں چاٹ لیتے ہیں
کفِ افسوس مل نقصان چاہے دشمنوں کا ہو
صداقت کا تقاضا ہے یہ عظمت کی نشانی ہے
اُسے تسلیم کر احسان چاہے دشمنوں کا ہو
تمہارے مرتبے کا فیصلہ ہمت سے ہونا ہے
دکھا جوشِ ہنر، میدان چاہے دشمنوں کا ہو
تباہی کے معانی ہر زباں میں ایک جیسے ہیں
منامت جشن گھر ویران چاہے دشمنوں کا ہو
حقیقت کی ہتھیلی پر فسانہ سج نہیں سکتا
یہ تیرا ہے بظاہر جان، چاہے دشمنوں کا ہے

ہم اذیت میں بھی اظہارِ ہنر رکھتے ہیں
ہونٹ سل جائیں تو آوازِ نظر رکھتے ہیں
حیف عشاق نے بہروپ شکاری کا بھرا
بات کرتے ہیں ادھر، دھیان اُدھر رکھتے ہیں
چھوڑ کر دید کی خواہش انہیں محسوس کرو
وہ جو رفتار میں خوشبو کا ہنر رکھتے ہیں
کتنے حساس ہوئے میرے حواسِ خمسہ
تیرے ہر سانس کی حرکت پہ نظر رکھتے ہیں
رہ میں ستائیں تو منزل پہ قیامت ٹوٹے
ساری دُنیا سے جدا طرزِ سفر رکھتے ہیں
شاہ کے خفیہ خزانوں کی حقیقت کیا ہے؟
ہم گنہگار خدا کی بھی خبر رکھتے ہیں
یہ کرامت ہی کرامت ہے مسافت نہ کہو
منزل آتی ہے اُدھر پاؤں جدھر رکھتے ہیں
رُخِ روشن کسی پتھر کا نمونہ کیوں ہے
دل میں وہ درد کا احساس اگر رکھتے ہیں
پوچھ لو گردشِ دوراں کے ارادے ہم سے
لوحِ محفوظ کے لکھے پہ نظر رکھتے ہیں
یاد ہیں تین سبق حسن چمن سازی کے
پاسِ گل، پاسِ نمو، پاسِ ثمر رکھتے ہیں
جنبشِ لب کی انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں
اسمِ اعظم کا جو آنکھوں میں اثر رکھتے ہیں
جی میں جو آئے کرو تم کو ہے زیبا لیکن
اہلِ فن، زیرِ نظر، زیر و زبر رکھتے ہیں
جان کم حوصلہ انساں کے مقدر میں نہیں
زندہ دل لوگ ہی سرمایۂ سر رکھتے ہیں

عباس تابش/لاہور

چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا — عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے

عباس تابش کی حیثیت ایک ایسی درس گاہ کی ہے جہاں اصیل شاعری کا فن مکمل طور پر سیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے آپ کو سبق لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ بس ایک دفعہ اس کی شاعری کے چمن زار سے گزر جایئے یہ ہنر آپ پر خود ہی وا ہوتا چلا جائے گا۔ اپنے تازہ کار ہم عصروں کو متاثر کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے جس میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ میں اس کی شاعری کا شروع ہی سے قائل بھی ہوں اور اس کے لیے دُعا گو بھی۔ (ظفر اقبال)

دی ہے وحشت تو یہ وحشت ہی مسلسل ہو جائے
رقص کرتے ہوئے اطراف میں جنگل ہو جائے
اے مرے دشت مزا جو! یہ مری آنکھیں ہیں
ان سے رومال بھی چھو جائے تو بادل ہو جائے
چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے
حالتِ ہجر میں جو رقص نہیں کر سکتا
اُس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ پاگل ہو جائے
میرا دل بھی کسی آسیب زدہ گھر کی طرح
خود بخود کھلنے لگے خود ہی مقفل ہو جائے
ڈوبتی ناؤ میں سب چیخ رہے ہیں تابش
اور مجھے فکر غزل میری مکمل ہو جائے

یار سے کوئی تعلق نہ غمِ یار کے ساتھ
کوئی اتنا بھی نہ ہو گرمیِ بازار کے ساتھ
حالتِ جنگ میں آدابِ خور و نوش کہاں
اب تو لقمہ بھی اُٹھاتا ہوں میں تلوار کے ساتھ
ناشنایانِ سخن! اب تو معافی دے دو
اب تو غالب کا تعلق نہیں دربار کے ساتھ
ایک ہو جاتی ہے دنیا مرے اندر باہر
میں سرِ شام اُجڑ جاتا ہوں بازار کے ساتھ
عشق کرنا کوئی آسان نہیں ہے تابش
ایک ہی شخص سے اور ایک ہی معیار کے ساتھ

اسی لیے تو اندھیرے بھی کم نہیں ہوتے
کہ اپنے جسم چراغوں میں ضم نہیں ہوتے
خدا پہ چھوڑیے صاحب! معاملہ دل کا
ہماری عمر میں قول و قسم نہیں ہوتے
اور اب ہے اس لیے افسوس اپنے ہونے کا
کسی کے ہو گئے ہوتے تو ہم نہیں ہوتے
وہ ہم ہیں جن کا نہ ہونا بھی ہونے جیسا ہے
وہ ہم ہیں جن کے وجود و عدم نہیں ہوتے
عجیب لوگ ہیں یہ خاندانِ عشق کے لوگ
کہ ہوتے جاتے ہیں قتل اور کم نہیں ہوتے
ہماری آہٹیں سننے کے منتظر لوگو!
ہمارے ساتھ ہمارے قدم نہیں ہوتے
ابھی سے ترکِ تعلق کی بات کرتے ہو
یہ فیصلے تو میاں ایک دم نہیں ہوتے
تمہیں میں اس لیے خود سے جدا سمجھتا ہوں
کہ مجھ سے اپنے قصیدے رقم نہیں ہوتے

عشق زادوں کے لہو کا یہ اثر لگتا ہے
آج بھی دشت میں نیزے کو ثمر لگتا ہے
کوفہ و شام مراحل ہیں گزر جائیں گے
یہ مدینے سے مدینے کا سفر لگتا ہے
کوئی گٹھڑی تو نہیں ہے کہ اُٹھا کر چل دوں
شہر کا شہر مجھے رختِ سفر لگتا ہے

اس زمانے میں غنیمت ہے غنیمت ہے میاں
کوئی باہر سے بھی درویش اگر لگتا ہے
بند آنکھوں سے کبھی دیکھا نہیں ہے اُس کو
اس لیے دوست بھی تا حد نظر لگتا ہے
کاش لوٹاؤں کبھی اُس کا پرندہ اُس کو
اچھا مصرعہ مجھے ٹوٹا ہوا پر لگتا ہے
میرے اِس وہم نے محتاط کیا ہے مجھ کو
بات کرنا بھی مجھے عرضِ ہنر لگتا ہے

یوں ہی نہیں یہ آگ مرے گھر لگی ہوئی
''تختی ہے تیرے نام کی در پر لگی ہوئی''
میں ٹھیک سے قدم نہیں زینوں پہ رکھ سکا
میری نگاہ تھی کہیں اُوپر لگی ہوئی
کیوں پھیرتی ہے چاند کے بالوں میں اُنگلیاں
کس کام پر ہے شاخِ صنوبر لگی ہوئی
اتنے دھویں میں یہ نہیں معلوم ہو رہا
گھر میں ہے یا ہے گھر کے برابر لگی ہوئی
میں نے کیا مکان میں چھڑکاؤ زہر کا
دیمک تھی میرے جسم کے اندر لگی ہوئی
تجھ تک پہنچ کے اس لیے آنکھیں بھر آئی ہیں
میں بھولتا نہیں کوئی ٹھوکر لگی ہوئی

ڈاکٹر صغریٰ صدف

ڈاکٹر صغریٰ صدف اُردو اور پنجابی کی معروف ادیبہ ہیں۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ نامور شاعرہ، معروف کمپیئر، محققہ اور پنجابی انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج کی ڈپٹی ڈائریکٹر۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ بیرونِ ملک بہت سے عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکی ہیں۔ بہت سی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ تاہم اُن کا اُردو شاعری کا مجموعہ ''وعدہ'' خاصا مقبول ہے۔

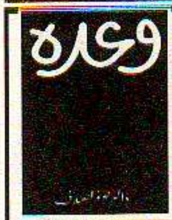

اس دشتِ آرزو میں بکھرنے تو دے مجھے
اعلانِ وحشتوں کا وہ کرنے تو دے مجھے
یہ میرا مسئلہ ہے کہ کیسے کروں قیام
پہلے وہ اپنے دل میں اُترنے تو دے مجھے
دیکھے تو ایک بار کبھی وہ بھی پیار سے
تکمیل اپنی ذات کی کرنے تو دے مجھے
پھر دل سے کر رہی ہے کوئی اور ساز باز
اے خواہشِ وصال نکھرنے تو دے مجھے
نکھریں گے اور دیکھنا پھر میرے خدوخال
آنکھوں کے آئینے میں سنورنے تو دے مجھے
اِک پل سہی پر آنکھ سے یونہی گزر نہ جا
کچھ رنگ آرزوؤں کے بھرنے تو دے مجھے
قطرے سے میں بنوں گی سمندر مگر صدفؔ
یہ شرط ہے وہ جاں سے گزرنے تو دے مجھے

کرے وصال کہ ہجراں کی انتہا ہی کرے
بدن کو درد کی شدت سے آشنا ہی کرے
وہ کچھ کہے مجھے تنہائی کی مسافت میں
یہ نیک بخت محبت کوئی خطا ہی کرے
کوئی تو بات چلے کوئے یار میں میری
برا ہی کوئی کہے مجھ کو، بس گلہ ہی کرے
میں جانتی ہوں کوئی اور بھی ہے اس کے قریب
رہے نہ ساتھ مرے پر کبھی ملا ہی کرے
وہ خامشی کی زباں میں کہے، کہے تو سہی
نہ کچھ کہے تو مرا حالِ دل سنا ہی کرے
سوا اُس فقیر سے کہنا کہ تھک گئی ہوں میں
دُعا نہیں مجھے دیتا تو بددُعا ہی کرے
اگرچہ ختم ہوئے سلسلے صدفؔ اس سے
کسی سے وہ مرا پوچھے، کبھی پتا ہی کرے

نقصان تیرے دھیان میں اکثر ہوا مرا
ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گیا آئنہ مرا
وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ خوش ہوں میں اس کے ساتھ
واقف نہیں ہے درد سے درد آشنا مرا
میں پوچھ ہی نہ پائی تھی، کس حال میں ہے وہ
بے حال راستوں میں ملا ہم نوا مرا
میں اس کو ڈھونڈتی ہوں کہیں دل کے آس پاس
اور دل میں جھانکتا ہی نہیں بے وفا مرا
نکھرا کبھی جو حسن مرا اُس کی یاد میں
پھر آئنہ بھی کر نہ سکا سامنا مرا
بے دخل ہو چکا ہے جو دل کے دیار سے
دُنیا سمجھ رہی ہے اُسے آشنا مرا

اپنا سکے اُسے نہ کبھی دل کی بات کی
یہ زندگانی ہم نے بسر جس کے سات کی
اُتری ہوئی ہے رات مقدر کے شہر میں
بے رنگ ہو چلی ہے دھنک میرے ہات کی
لگتا ہے تیری آنکھ ہے میرے وجود میں
رکھتی ہے جو خبر مری اِک ایک بات کی
دیکھوں میں کس طرح حدِ امکان سے پرے
ہوں بند کوٹھری میں تری کائنات کی
آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ چرا لے گیا مجھے
تفصیل کیا بیان ہو اس واردات کی
مقتل بنا ہوا ہے مرا شہر ان دنوں
اب راہ سوجھتی نہیں کوئی نجات کی
سانسیں ہیں زخم زخم تو موسم ہیں بے ردا
دہرا رہا ہے وقت کہانی فرات کی
پہلے قدم قدم پہ بہاروں کا راج تھا
اب خون میں نہائی ہے وادیِ سوات کی
صحنِ وطن میں ایسے اندھیرا ٹھہر گیا
دن کا شعور مجھ کو نہ پہچان رات کی
بے خواب موسموں میں لٹا قافلہ مرا
اپنے ہی لکھ رہے تھے کہانی یہ مات کی
اُلجھی ہوئی سی پھرتی ہے کچھ دن سے یہ ہوا
دیکھی ہے وحشت اس نے ابھی ایک رات کی
دشوار ہے جدائی تو مشکل ہے ہمرہی
طے کس طرح کروں میں مسافت حیات کی
جس کی رضا کو اپنی رضا جانتی رہی
اُس نے نفی ہی کی ہے صدفؔ میری ذات کی

پاکستانی میڈیا دنیا بھر میں پاکستان کا امیج خراب کر رہا ہے۔ سلیمان جاذب

متحدہ عرب امارات میں شاعر اور صحافی سلیمان جاذب کے ساتھ عامر بن علی کی ہونے والی گفتگو

سلیمان جاذب کا بطور شاعر اور انٹرنیٹ جرنلسٹ تعارف تو ادبی رسائل اور اخبارات کے ذریعے ادبی ذوق رکھنے والے باقی دوستوں کی طرح مجھے بھی تھا۔ گزشتہ برس اتفاق سے میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ان کی شخصیت کی اِک نئی جہت سامنے آئی اور وہ تھی ایک کامیاب ایونٹ منیجر اور اعلیٰ منتظم ہونے کی۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ عجمان میں سلیمان جاذب نے خوبصورت لہجے کے مقبول شاعر وصی شاہ کے اعزاز میں ایک شام کا انعقاد کیا تھا۔ لاطینی امریکہ جاتے ہوئے مختصر وقت کے لیے میں بھی متحدہ عرب امارات آیا ہوا تھا۔ وصی شاہ کے ساتھ منائی جانے والی شام میں شرکت کی جب دعوت ملی تو میرے ذہن میں یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس لوگ ہوں گے اور بیرونِ ملک ہونے والی ادبی تقریب کی طرح شاید یہ بھی کوئی مختصر سی تقریب ہوگی۔ وہاں تو منظر ہی اور تھا۔ تقریب میں پہنچ کر میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ ہزار کے قریب لوگ فائیو سٹار ہوٹل کے سب سے بڑے ہال میں موجود ہیں۔ کوئی سعودی عرب سے آیا ہے تو کوئی کویت اور بحرین سے۔ دوبئی اور ابوظہبی شارجہ کے لوگ تو گویا میزبان بنے ہوئے تھے۔ مجھے جب اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا تو میرے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ مشکل ہو رہا تھا کہ پاکستان سے باہر آج تک میں نے کسی ادبی تقریب کا اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا تھا۔ کھانے کے علاوہ ہر مہمان کو ایک ننھے سے پرفیوم کا تحفہ بھی دیا گیا۔ بلاشبہ اس تقریب میں لوگوں کی تعداد اور جوش و خروش میں میرے خوبصورت شاعر دوست وصی شاہ کی شخصیت کی سحر انگیزی ہی بنیادی محرک تھی مگر جس انداز میں اس تقریب

کے لیے اعلیٰ انتظامات کے گئے اور لوگوں کو متحرک کیا گیا اس کا سہرا تھا سلیمان جاذب کے سر پر۔ اس شام تو وہ بھی مصروف تھے اور میں نے بھی اگلے دن برازیل روانہ ہونا تھا اس لیے ان سے تفصیلی بات چیت نہ ہو سکی مگر گزشتہ دنوں میرا دوبئی جانا ہوا تو وہاں کی ادبی و سماجی تقریبات کے روحِ رواں سلیمان جاذب سے تفصیلی گفتگو ہوئی جو کہ ارژنگ کے قارئین کی نذر ہے۔

ارژنگ: عام چلن تو یہی ہے کہ نوجوان پہلے شاعری کی جانب آتے ہیں اور پھر صحافت یا کالم نگاری کا رُخ کرتے ہیں مگر آپ پہلے صحافی بنے بعد میں شاعری کی طرف آئے۔ پہلے ہمیں یہ معمہ سمجھائیے گا؟

سلیمان جاذب: میں نویں جماعت میں تھا جب میرا پہلا کالم شائع ہوا۔ اس لحاظ سے آپ کی بات بجا ہے کہ میرا پہلا تعارف بطور صحافی ہے اور شاعری کے حوالے سے میرا تعارف لوگوں میں بعد میں پہنچا۔ نثر میں میرا ہاتھ شروع سے ہی رواں تھا۔ بچپن میں ہی اپنی کلاس اور سکول کے دیگر طلباء کے لیے تقاریر لکھ کر دیا کرتا تھا لیکن شعری موزونیت بھی موجود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ نثری حوالے سے تعارف ذرا پہلے لوگوں تک پہنچا۔

ارژنگ: کیا کوئی شعری مجموعہ بھی شائع ہوا ہے؟

سلیمان جاذب: ہاں! ''تیری خوشبو'' کے نام سے شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

ارژنگ: آپ کی ویب سائٹ تو یہاں خاصی مقبول ہے۔ ویب جرنلزم کے علاوہ بھی کہیں لکھتے ہیں؟

سلیمان جاذب: روزنامہ نئی بات میں آج کل لکھنا شروع کیا ہے۔ یہاں میں اس اخبار کا بیورو چیف بھی ہوں اور کالم بھی لکھ رہا ہوں۔

ارژنگ: آپ معروف صحافی بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ایونٹ مینجمنٹ کیسے کر پاتے ہیں؟

سلیمان: اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے سرفہرست تو یہ ہے کہ کمیونٹی بہت بڑی ہے۔ پاکستانیوں کے علاوہ برصغیر کے قرب و جوار میں جہاں کہیں سے بھی ہم زبان لوگ آتے ہیں اور یہاں پائے جاتے ہیں وہ ہمارے ٹارگٹ سامعین و ناظرین ہیں۔ آپ اگر مجھے کامیاب منتظم کے طور پر سوال کر رہے ہیں کہ میری کامیابی کی وجہ کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس

کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ لوگوں کی پسند کا خیال رکھتا ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ اور کس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری وجہ کہ ہر چیز کی کمرشل ویلیو کا بھی خیال رکھتا ہوں۔

ادبی پروگراموں کے علاوہ میں نے گزشتہ دنوں یہاں حدیقہ کیانی، عمر شریف اور منی بیگم کے شو کرائے ہیں۔ خوش قسمتی یا اتفاق کہہ لیں کہ عربی تقریبات میں ہماری کمیونٹی کی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ اگر آپ پاکستان سے کوئی بھی ایسی سلیبرٹی بلاتے ہیں اور ٹھیک انداز میں اس کی مارکیٹ کرتے ہیں تو پھر کامیابی یقینی ہوتی ہے۔

ارژنگ: کیا آپ نے اس شعبے میں تعلیم بھی حاصل کی ہے؟ یا پھر محض اتفاق سے ہی ادھر آ نکلے؟

سلیمان جاذب: تعلیم تو میں نے شماریات کے شعبے سے متعلق حاصل کی تھی اور یہاں میری پہلی نوکری بھی اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ہی تھی مگر آہستہ آہستہ مجھے شماریات کا شعبہ بورنگ محسوس ہونا شروع ہو گیا اور میں نے تقریبات کا رخ کیا۔ آج کل میں بطور ایونٹ منیجر ہی کام کر رہا ہوں۔

ارژنگ: کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہیے؟

سلیمان جاذب: ادیب طبقہ ان لوگوں میں سے ہے معاشرے میں جن کو زندگی اور حالات کا ادراک باقی عوام سے قدرے بہتر ہوتا ہے۔ سیاست بھی عوامی خدمت کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے اور اس ذریعے سے اگر کوئی ادیب عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اسے ضرور سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔

ارژنگ: شاعری اور صحافت کو اگر ایونٹ منیجر کی نظر سے دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

سلیمان جاذب: صحافت اور شاعری کی وجہ سے پروگرام اور تقریبات کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری اور صحافت کی وجہ سے لوگوں میں آپ کا تعارف موجود ہوتا ہے اور پھر اس سے زبان و بیان میں بھی نکھار آ جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ براہ راست پاکستان کے میڈیا سے بھی منسلک ہیں۔ کیا آپ میڈیا کے موجودہ کردار سے مطمئن ہیں؟

سلیمان جاذب: پاکستان کے مسائل اُجاگر کرنے کے حوالے سے اگرچہ میڈیا اچھا کردار ادا کر رہا ہے مگر منفی رپورٹنگ کے سبب باہر دنیا میں رہتے ہوئے اس انداز سے منفی تصویر ہی بن رہی ہے۔ میڈیا کسی طرح بھی ملک کے امیج کے لیے مثبت کام نہیں کر رہا بلکہ میں تو کہوں گا کہ میڈیا کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان کا امیج خراب ہو رہا ہے۔ اگر باہر دنیا میں ہمیں کہا جاتا ہے کہ آپ سب دہشت گرد ہیں تو یہ انہیں پاکستانی میڈیا ہی بتا رہا ہے۔ میڈیا ملک کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔

ارژنگ: متحدہ عرب امارات میں اردو ادب کے کیا حالات ہیں؟

سلیمان جاذب: UAE میں اُردو کے حوالے سے اچھا خاصہ کام ہو رہا ہے۔ پاکستانی نژاد ادیب کبیر خان کو کشمیر کے وزیر اعظم کا ایوارڈ ملا ہے۔ مقامی عرب ڈاکٹر زبیر فاروق اردو شاعری کرتے ہیں اور ان کے تیس سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو سب کے سب اُردو میں ہیں۔ مگر پھر بھی یہاں کے جو ادیب اُردو ادب سے وابستہ ہیں وہ پاکستان سے ہی آئے ہوئے ہیں۔ پاکستانی خاندانوں کے جو بچے یہاں پیدا ہوتے ہیں وہ اُردو لکھ اور پڑھ نہیں سکتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ بڑا نقصان ہو گیا ہے۔

ارژنگ: پاکستان کے ادیبوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

سلیمان جاذب: اہل قلم دوستوں سے تو یہی گزارش ہے کہ اگر ادبی گروہ بندیاں ختم کر دیں گے تو ادب اور زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس کی بہتر ترویج ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی ادبی گروہ بندیوں کے نقصانات ہمیں یہاں بیٹھے اور زیادہ شدید ہوتے ہیں کہ جب ہم مشاعرے کراتے ہیں تو شاعروں کی طرف سے اس طرح کی شرطیں رکھی جاتی ہیں کہ اگر فلاں شاعر آئے گا تو پھر میں نہیں آؤں گا۔ ان لوگوں کو بلائیں گے تو ہم لوگ نہیں آئیں گے۔ ان ادبی گروہ بندیوں کی وجہ سے ہم لوگ بڑے بڑے مشاعرے کرنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں۔

ایڈیٹر کی ڈائری

۱- لکھنؤ میں سارک رائٹرز کانفرنس
۲- اسلام آباد بار کونسل کا مشاعرہ
۳- اولڈ راوینز کا عالمی مشاعرہ
۴- عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں ابرار ندیم کا ظہرانہ
۵- عامر بن علی اور جمشید مسرور کے اعزاز میں تقاریب
۶- گوندلا والہ میں ایک یادگار مشاعرہ
۷- میواتی دُنیا کا ماہانہ مشاعرہ

☆ ماحولیات کے حوالے سے سارک رائٹرز کی کانفرنس بھارت کے شہر لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس میں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا، بھوٹان، افغانستان، مالدیپ اور میانمر سے دوسو سے زائد ادیبوں، فن

کاروں اور اسکالرز نے شرکت کی۔ پاکستان سے احمد سلیم، ڈاکٹر ناہید شاہد، نشو جی، ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد، اقبال باہو، عکسی مفتی، حضرت شام، نثار اے چودھری، فرحین چودھری، نبیلہ رحمٰن، عائشہ ذی خان، حلیمہ یاسمین، کرن بشیر احمد، مہوش خان، نیرہ رحمٰن، ارباب داؤد، حمزہ حسن شیخ، سیّد ذوالفقار گیلانی، تہمینہ محمود کے علاوہ راقم نے شرکت کی۔ لکھنؤ کے کلارک اودھ اور بیسٹ ویسٹرن ہوٹلز میں ادیبوں کی کثیر تعداد میں آمد نے میلے کا سماں پیدا کر دیا۔ کانفرنس کی تمام تقاریب فوراسٹار ہوٹل کلارک اودھ کے دیدہ زیب ہالز میں منعقد ہوئیں۔ اس چار روزہ کانفرنس میں ماحول، آلودگی اور ہماری کائنات کو درپیش حضرات کے حوالے نامور اسکالرز نے اپنے مقالے پڑھے۔ وقفے وقفے سے شعراء بھی اپنا کلام پیش کرتے رہے جس کے سبب کانفرنس میں دلچسپی برقرار رہی۔ شاعری اپنی ماں بولی اور انگلش ٹرانسلیشن میں سنائی گئی۔ کانفرنس کی روح ورواں اجیت کور اور اُن کی بیٹی ارپنا کور کی مسلسل موجودگی نے کانفرنس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ مختلف ملکوں کے فنکاروں نے فن کا مظاہرہ کر کے اپنے کلچر کو متعارف کروایا۔ موسیقی، گائیکی اور رقص کی محافل بھی برپا ہوئیں۔ پاکستان کے نامور گائیک اقبال باہو نے صوفیانہ کلام گا کر میلہ لوٹ لیا۔ مگر صد افسوس وطن واپس پہنچتے ہی اُن کی اچانک وفات نے کانفرنس میں شریک ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا اور وہ اپنے لاکھوں مداحین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گئے۔ بلاشبہ اقبال باہو ایک بڑے فن کار اور انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کانفرنس کی تقریب ایوارڈ میں چودھری نثار اے سنی کو بہترین کنونیئر کا ایوارڈ دیا گیا۔ ڈھول بجانے والے اور ڈھول کی تھاپ پر دُھمال ڈالنے والے پاکستانی فن کاروں نے بھی ماحولیات کے حوالے سے ہونے والی اس کانفرنس کو گرمائے رکھا۔ سوئمنگ پولز کے کنارے مدھم مدھم میوزک کے ساتھ بوفے ڈنرز کے دوران مختلف ملکوں کے شاعروں ادیبوں کو ایک دوسرے سے اظہارِ خیال کے بھرپور مواقع میسر آئے۔

لکھنؤ کے اہم مقامات کی سیر کی گئی جن میں تاریخی مساجد، امام بارگاہیں، میوزیم، قیصر باغ، شہید پارک، ریلوے اسٹیشن، حضرت گنج کے علاوہ گومتی ندی کے کنارے واقع ہنومان کا مندر شامل ہے۔ بہت سی تاریخی عمارات کی جگہ اب جدید عمارات تعمیر ہوگئی ہیں۔ تہذیبی اور تاریخی آثار تو موجود ہیں مگر اُردو زبان کا لکھنوی لہجہ اور لباس میں کرتا شلوار اب ناپید ہے۔ نوابوں کی باقیات تو ہیں مگر کوئی گونج سنائی نہیں

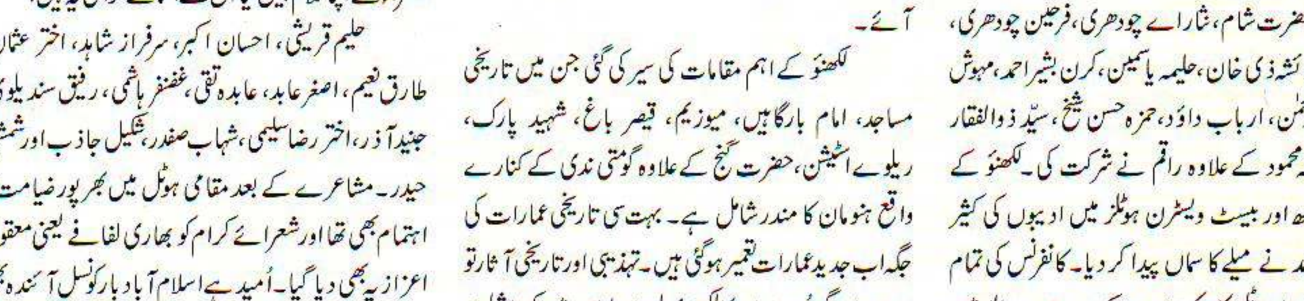

دیتی۔ کوئی صدا بلاتی نہیں۔ بھارت کی تیز رفتار لگژری گاڑیوں میں امرتسر سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے دہلی کا سفر نہایت خوشگوار رہا۔ دہلی کے گلی کوچوں میں آوارہ گردی کو تو بہت جی چاہ رہا تھا مگر اگلے روز یومِ پاکستان کے حوالے سے پی ٹی وی ہوم کے مشاعرے کی صدارت کرنا تھی اس لیے تمام دوستوں کو خیرباد کہہ کر دلی سے By air واپس آ گیا۔ دلی ایئرپورٹ کی دلکشی اور بانکپن کسی راجستھانی دلہن سے کم نہ تھا۔

☆ اسلام آباد بار کونسل کا مشاعرہ معروف شاعر افتخار عارف کی صدارت میں اسلام آباد بار کونسل کے ہال میں منعقد ہوا۔ علی یاسر جدید غزل کے نہایت معتبر شاعر اور محبت کرنے والے دوست ہیں۔ انہوں نے اس میں بطورِ خاص مدعو کیا تو انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ یوں مقامی شعراء کے علاوہ راقم لاہور سے واحد مہمان شاعر تھے۔ مشاعرے کے مہمانِ خصوصی سیّد مجتبیٰ حیدر شیرازی تھے۔ نظامت کے فرائض علی یاسر نے سرانجام دیے۔ اسلام آباد بار کونسل کے صدر سر جاوید اکبر شاہ نے مہمان شعراء کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔ اس مشاعرے میں کثیر تعداد میں وکلاء نے شرکت کی اور ہر اچھے شعر پر دل کھول کر داد دی۔ لطیف اور شگفتہ جملہ بازی بھی جاری رہی۔ حسبِ معمول مزاحیہ شعراء نے اپنا بیشتر کلام سنایا بہرحال جو کہ ایک اچھی روایت نہیں اس مشاعرہ میں راقم کے علاوہ جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حلیم قریشی، احسان اکبر، سرفراز شاہد، اختر عثمان، طارق نعیم، اصغر عابد، عابدہ تقی، غضنفر ہاشمی، رفیق سندیلوی، جنید آذر، اختر رضا سلیمی، شہاب صفدر، شکیل جاذب اور شمشیر حیدر۔ مشاعرے کے بعد مقامی ہوٹل میں بھرپور ضیافت کا اہتمام بھی تھا اور شعرائے کرام کو بھاری لفافے یعنی معقول اعزازیہ بھی دیا گیا۔ اُمید ہے اسلام آباد بار کونسل آئندہ بھی ایسے مشاعروں کا اہتمام کرتی رہے گی۔

☆ ممتاز شیخ اسلام آباد میں ہمارے بہت ہی پیارے اور ہردلعزیز دوست ہیں۔ اُن کی شعر و ادب سے محبت مثالی ہے۔ اولڈ راویز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری نہایت محرک اور فعال شخصیت ہیں۔ وہ گاہے بگاہے مختلف تقاریب کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ اولڈ راویز کا سالانہ مشاعرہ اسلام آباد میں ایک یادگار مشاعرہ ہوتا ہے۔ راقم کو ہر سال مدعو کیا جاتا ہے۔ اس بار بھی یہ مشاعرہ اسلام آباد آرٹس کونسل کے ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت معروف

ادیبہ کشور ناہید نے کی۔ مہمانِ خصوصی افتخار عارف اور مہمانِ اعزاز اعتزاز احسن تھے۔ ملک اور بیرونِ ملک سے شعراء کی کثیر تعداد نے اس مشاعرے میں شرکت کی جن میں انور شعور، توصیف تبسم، باقی احمد پوری، اظہار الحق، سیّد نصرت

زیدی، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، احسان اکبر، سرفراز شاہد، عباس تابش، حسن عباس رضا، عنبرین صلاح الدین، طارق نعیم، غضنفر ہاشمی، اصغر عابد، سعود عثمانی، فاضل جمیلی، اختر رضا سلیمی، رخشندہ نوید، شائستہ نزہت، احمد حسین مجاہد، جنید آزر، شکیل جازب، رُخسانہ سحر، نورین طلعت عروبہ، محبوب ظفر، شکیل جاذب اور راشدہ مہین

☆ ممتاز شیخ کی خوبصورت نظامت اور سامعین کی بھرپور شرکت نے مشاعرے کو یادگار بنا دیا۔ واپسی پر باقی احمد پوری کے ساتھ سفر نہایت خوشگوار رہا۔

☆ ممتاز کالم نویس، ڈرامہ رائٹر، مزاح نگار اور شاعر جناب عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں معروف شاعر ابرار ندیم نے ایک ظہرانے کا اہتمام کیا جس میں شہزاد احمد، مجیب الرحمٰن شامی، خالد شریف، اسلم کولسری یاسر پیرزادہ، ڈاکٹر صغریٰ صدف، حافظ مظفر محسن، عزیر احمد اور راقم کے علاوہ دیگر احباب نے شرکت کی۔ یہ تقریب جناب عطاء الحق قاسمی کو مجلس فروغ اُردو ادب کی طرف سے بہترین مزاح نگار کے ایوارڈ کے اعلان کی خوشی میں تھے اس لیے تمام احباب نے انہیں مبارک باد دی۔ کھانے کا اہتمام نہایت پرتکلف تھا۔

ڈیفنس لاہور میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں چند منتخب شعراء کو مدعو کیا گیا جنہوں نے اپنا بہت سا کلام سنایا۔ اس مشاعرے میں فیملیز نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ صدارت معروف شاعر امجد اسلام امجد نے کی۔ دیگر شعراء میں راقم کے علاوہ عباس تابش، زاہد فخری، ڈاکٹر صغریٰ صدف، سیّد سلیمان گیلانی، وصی شاہ، علی زریون اور صابر علی صابر تھے۔ سامعین نے شعراء کو بھرپور داد دی۔ مشاعرے کے بعد نہایت پرتکلف ڈنر کا اہتمام تھا۔ شعراء کو اعزازیے میں خطیر رقم بھی پیش کی گئی۔ نجی سطح پر اس طرح کی تقاریب کا اہتمام نہایت خوش آئند ہے۔

☆ معروف شاعر اور ماہنامہ ارژنگ کے چیف ایڈیٹر عامر بن علی جاپان سے چند روز کے لیے پاکستان آئے تو ڈاکٹر صغریٰ صدف نے اُن کے اعزاز میں ڈنر دیا جس میں ناروے سے آئے ہوئے شاعر جمشید مسرور کے علاوہ یاسر پیرزادہ، وصی شاہ، شعیب بن عزیز، حسین مجروح، ذوالقرنین، انور عباسی، صفدر اور راقم نے شرکت کی۔ ڈنر سے قبل عامر بن علی کے بعد جمشید مسرور سے بھی اُن کا تازہ کلام سنا گیا۔

☆ معروف شاعر شہزاد نیر اور اُن کے دُبئی میں مقیم دوست عرفان قریشی نے اپنے گاؤں گوندلا والہ (گوجرانوالہ) میں ایک شاندار یادگار مشاعرے کا اہتمام کیا

جس کی صدارت نامور شاعر امجد اسلام امجد نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی معروف شاعر جان کاشمیری اور مہمانانِ اعزاز عرفان صادق اور راقم تھے۔ یہ گوندلہ والا میں منعقد ہونے والا پہلا مشاعرہ تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ صرف پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ پنڈال سے باہر بھی لوگوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ بلکہ دیواروں اور چھتوں پر بیٹھ کر لوگ مشاعرہ سن رہے تھے۔ خواتین نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی۔ یوں لگتا تھا جیسے پورا گوندلا والا گھروں سے مشاعرہ گاہ میں آ گیا ہو۔ 2 بجے تک مشاعرہ جاری رہا۔ ہر اچھے شعر پر اتنی بھرپور داد دی گئی کہ اظہارِ خیال میں مہمان شعراء کو کہنا پڑا کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اس گاؤں میں پہلا مشاعرہ ہے۔ مشاعرہ میں مختلف شہروں سے کثیر تعداد میں شعراء نے شرکت کی۔

بلاشبہ مشاعرہ کی کامیابی میں شہزاد نیر کی جاندار کمپیئرنگ کا بھی کمال تھا اور دونوں منتظمین شہزاد نیر اور عرفان قریشی کی شب و روز کی محنت بھی شامل تھی۔

☆ ناروے سے آئے ہوئے معروف شاعر جمشید مسرور کے اعزاز میں راقم نے آواری ہوٹل میں ظہرانہ دیا جس میں نامور ادیب عطاء الحق قاسمی، ماضی کی معروف اداکارہ نشو کے علاوہ ڈاکٹر صغریٰ صدف، عباس تابش، افضل عاجز، عزیر احمد، حافظ مظفر محسن اور یاسر پیرزادہ نے شرکت کی۔ سب شعراء نے اپنا کلام سنایا اور آخر میں جمشید مسرور سے اُن کا کلام سنا گیا۔

اکیڈمی ادبیات آف پاکستان لاور اور میواتی دُنیا کے اشتراک سے اکیڈمی کے دفتر میں مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت اعجاز کنور راجہ نے کی۔ مہمانِ خصوصی جمشید مسرور اور مہمان اعزاز راقم تھے۔ اس مشاعرے میں شعراء کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں سردار سوز، عظیم اللہ، خلش بجنوری، در نجف زیبی، سعید عاصم، جاوید رضی، عینی راز، ناصر علی، کامران ناشط، حماد نیازی، احمد عطا، نگہت اکرم، شہریار، مقصود عامر، رضا عباس رضا کے علاوہ بہت سے شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔

جمشید مسرور (ناروے) کے اعزاز میں ڈاکٹر صغرا صدف نے ایک عشائیہ دیا جس میں عطاء الرحمٰن، ڈاکٹر اجمل نیازی، معروف گلوکار شوکت علی، ایوب ندیم، اعزاز احمد آذر، عباس تابش، حسین شاد، راجہ نیر، حافظ مظفر محسن، سرفراز سیّد، غافر شہزاد، تسنیم کوثر، نیلم احمد بشیر، شاہدہ دلاور شاہ، شفیق احمد خان، احمد عطا اور راقم نے شرکت کی۔ تقریب میں جمشید مسرور کی شاعری اور شخصیت سے متعلق گفتگو کی گئی اور اُن سے اُردو اور پنجابی میں بہت سا کلام سنا گیا۔

خالد خواجہ/امریکہ

میں ایک عمر سے ان دائروں کا قیدی ہوں
قدم جہاں بھی رکھوں دائرہ نکلتا ہے

شاعری تمہاری پہچان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تم نے جب جب شعر کہا ہے حق ادا کر دیا ہے۔ تمہارا مجموعہ سرشام تمنا، ایک طویل انتظار کے بعد اس وقت منظر عام پر آیا ہے۔ جب تمہارے احباب اور تمہاری شاعری کے دلدادہ لوگ تمہاری لاپروائی اور بے نیازی سے تقریباً مایوس ہو گئے تھے۔ تمہاری صحیح پہچان تمہاری غزل ہے ایک سرے سے صفحے پلٹتے جائیں تو تقریباً ہر صفحے پر ایک دو شعر دامن تھام لیتے ہیں اور پوری توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ بھائی میرے بات بنتی ہی تب ہے جب شعر میں برکت ہو اور خالد خواجہ تمہیں مبارک ہو کہ تمہارے شعر میں برکت ہے۔ وطن میں سب کچھ سہی، تمہارا گھر نہیں ہے، وہاں بچھڑی ہوئی محبتیں ہیں یا بزرگوں کی قبریں۔ تم دو زمینوں میں بٹ چکے ہو اور اب کوئی راہ نجات نہیں۔ خالد خواجہ تم ہجرتوں کے شاعر ہو۔ دُکھ سہتے ہو اور ہجرت کے الم رقم کرتے رہو۔

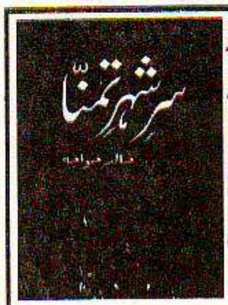

ایک پل بھی جدا نہیں ہوتا
تو کسی سے خفا نہیں ہوتا
کون سا وقت ہے ترا احساس
مثل دست صبا نہیں ہوتا
ہم سے بے آسرا کدھر جاتے
گر ترا آسرا نہیں ہوتا
نفرتوں سے نمٹنا مشکل تھا
تو جو دل میں بسا نہیں ہوتا
بے زبانی سی، بے زبانی ہے
شکر تیرا ادا نہیں ہوتا

پھر اجنبی نظام کو اپنا رہا ہوں میں
مدت کے بعد لوٹ کے گھر جا رہا ہوں میں
فطرت میں وسعتیں ہیں یہ کیفیتیں جدا
دریا رہا ہوں اور کبھی صحرا رہا ہوں میں
گلیوں میں رات چیختے لوگوں کا تھا ہجوم
چیخوں میں اپنا نام بھی سنتا رہا ہوں میں
عہد بہار دور سے کہہ کر گزر گیا
"تم میرا انتظار کرو آ رہا ہوں میں"
اِک خوف میری ذات کا حصہ بنا رہا
اِک عمر اپنی ذات میں سہما رہا ہوں میں
گوشہ نشین کر گئی یاروں کی کج روی
خالدؔ پرائے جرم پہ شرما رہا ہوں میں

جدھر بھی جاؤں یہی سلسلہ نکلتا ہے
تمہارے گھر کی طرف راستہ نکلتا ہے
میں ایک عمر سے ان دائروں کا قیدی ہوں
قدم جہاں بھی رکھوں دائرہ نکلتا ہے
جو شخص جان سے پیارا ہو شیخ صاحب کو
قسم خدا کی وہی دہریا نکلتا ہے
تمہارے شہر میں کیا کر رہے ہیں میرے لوگ
گلی، گلی سے مرا آشنا نکلتا ہے
نقاب پوشوں کا خالدؔ جی ایک شہر بھی ہے
ہر آستیں سے جہاں آئینہ نکلتا ہے

جیسے میرا ایک دشمن قید ہے
میرے اندر میرا بچپن قید ہے
بن سنور کر، تو کبھی کا جا چکا
عکس کے جادو میں درپن قید ہے
سر پٹک کر لوٹ جاتی ہے بہار
یوں خزاؤں میں وہ گلشن قید ہے
ہر حسیں پیکر پہ چسپاں اُس کی آنکھ
شیخ کے اندر برہمن قید ہے
ہر طرف پانی پس سیلاب بھی
بستیوں میں اب بھی ساون قید ہے

اس تصنع اور بناوٹ میں کہیں
آپ کا بے ساختہ پن قید ہے

کہیں بھی جا نہیں سکتا ہوں، گھر میں رہتا ہوں
میں اپنی ذات کے اندر سفر میں رہتا ہوں
مجھے ہی سوچتا رہتا ہے میرا اِک دشمن
میں دور رہ کے بھی دشمن کے گھر میں رہتا ہوں
شعور جب بھی مرا لاشعور بنتا ہے
تو خواب، خواب سے بنتے نگر میں رہتا ہوں
خوشا، یہ ساعت وجدانِ شعر خالدؔ جی
غزل کے شہر میں، نظم ہنر میں رہتا ہوں

کیسے ہو شرمسار، گنہگار، کچھ تو ہو
آخر ملامتوں کا بھی معیار کچھ تو ہو
اِک عمر ہو گئی ہے ہنسے ہیں نہ روئے ہیں
غم ہی سہی، خوشی نہ سہی، یار کچھ تو ہو
ایک ایک نام لے کے پکارو گلی، گلی
یہ شہر گہری نیند سے بیدار کچھ تو ہو
کچھ تو جوازِ ترکِ تعلق بھی سوچ لیں
تیری اَنا ہو یا مرا پندار، کچھ تو ہو
محفل میں آج اُس کی طرف دیکھنا نہیں
مجروح زعم یارِ طرح دار کچھ تو ہو

نصرت صدیقی

نصرت صدیقی ادب کا ایک ممتاز نام ہے۔ وہ مدت سے تخلیقی عمل میں سرگرم عمل ہیں۔ اس سے قبل ان کی دو تصانیف اہل ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ وہ تمام اصنافِ شعری مثلاً حمد و نعت، سلام و منقبت اور نظم، غزل، قطعہ، رباعی میں شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں ریاضتِ فن ہے تخلیقی لگن ہے۔ وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور وسیع تجربے کی بنیاد پر عصری تقاضوں کے حوالے سے شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات و مضامین کی کمی نہیں۔ روایت کا احترام اور جدت کا تلازمہ ان کے شعر کے دو بنیادی اجزا ہیں۔ قاری اور سامع ان کے اشعار پڑھ کر اور سن کر مسرت حاصل کرتا ہے اور حیرت میں غرق ہو جاتا ہے کہ اتنا عمدہ شعر، نہایت منفرد لہجے میں اس کے پڑھنے یا سننے کو ملا ہے۔

سنگ زن تو ہیں بہت آئینہ گر تھوڑے ہیں
کیوں نہ اُس سمت چلا جاؤں جدھر تھوڑے ہیں
ان سر شام چراغوں سے یہ ہوتا ہے گماں
کہکشاں اور ترے نجم و قمر تھوڑے ہیں
ابر و باراں بھی بدل سکتے تھے موسم کا مزاج
مانتا ہوں مری بستی میں شجر تھوڑے ہیں
مجھ کو یہ ڈر کہ اُجڑ جائے نہ ساری دُنیا
تجھ کو یہ فکر کہ یہ تیغ و تبر تھوڑے ہیں
بے ضرورت بھی بھرے اہل ہوس نے دامن
یوں بھی شاخوں پہ گل و برگ وثمر تھوڑے ہیں
مجھ کو جلنا تو ہے لیکن مرے جلنے کے لیے
زندگانی یہ ترے شام و سحر تھوڑے ہیں
نونہالانِ گلستاں میں ہوا ہوں تقسیم
کیسے کہہ دوں کہ مرے لختِ جگر تھوڑے ہیں
وہ مکیں ہیں مرے دل میں تو یہ ان کا ہے کرم
ورنہ ان کے لیے اس شہر میں گھر تھوڑے ہیں!
اپنے چہرے کے خدوخال چھپانے والے
وسعتِ دل کے لیے تیر نظر تھوڑے ہیں
جبر کی رُت ہو کہ موسم ہو زباں بندی کا
جو کسی دور میں جھکتے نہیں سر تھوڑے ہیں
اُن سے ملنے کی تمنا ہے مقدم نصرت
خود ہی بن جائیں گے اسباب اگر تھوڑے ہیں

مسئلے بیش و کم ہزاروں ہیں
ایک جاں اور غم ہزاروں ہیں
کوئی پڑھتا نہیں جبینوں پر
داستانیں رقم ہزاروں ہیں
ایک دو ہوں تو ذکر بھی کیجیے
اُن کی زُلفوں میں خم ہزاروں ہیں
اِس تعلق پہ غور فرماؤ
تم اکیلے ہو ہم ہزاروں ہیں
کوئی حد و حساب ہو تو کہوں
اُن کے لطف وکرم ہزاروں ہیں
یہ کسی ایک پر نہیں موقوف
پاسبانِ حرم ہزاروں ہیں
حق پرستی ہی تو نہیں آساں
اِک خدا ہے صنم ہزاروں ہیں
کوئی احمد ندیم سا ہوتا
یوں تو اہل قلم ہزاروں ہیں
کوئی منزل نما نہیں نصرت
یوں تو نقشِ قدم ہزاروں ہیں

اس لیے بھی کئی احباب خفا مجھ سے ہوئے
میزبانی کے فرائض نہ ادا مجھ سے ہوئے
سنگ ریزوں کو ملا لعل و گہر کا منصب
کتنے بے مایہ تھے جو بیش بہا مجھ سے ہوئے
اُس نے لے لینا ہے ایک ایک نشانے کا حساب
اس کی گنتی میں ہیں جو تیر خطا مجھ سے ہوئے
زندگی ساری گزاری ہے مشقت کرتے
پھر بھی صرصر کے بگولے نہ صبا مجھ سے ہوئے
بات دو دن کی ہے لیکن مجھے یوں لگتا ہے
جیسے جگ بیت گئے اس کو جدا مجھ سے ہوئے
جن کی گنتی نہیں کوئی نہ کوئی حد و حساب
اپنی ہی جان پہ وہ جور و جفا مجھ سے ہوئے
میں نے ہر غم کو اُڑایا ہے ہنسی میں نصرت
قید تھے جتنے پرندے وہ رہا مجھ سے ہوئے

تمام عمر تڑپنے کا حوصلہ نہ ہوا
تری جدائی کا ہم سے بھی حق ادا نہ ہوا
یہاں نصیب کسے مستقل ٹھکانہ ہوا
جو شب کو رُک بھی گیا صبح کو روانہ ہوا
اب آئے ہو تو مری روح میں اُتر جاؤ
تمہیں قریب سے دیکھے ہوئے زمانہ ہوا
یہ آئے دن کے حوادث کا فیض ہے شاید
کہ زندگی کا چلن اور باغیانہ ہوا
الٰہی خیر مرے دوستوں میں شامل ہے
وہ شخص جس سے کسی کا کبھی بھلا نہ ہوا
ہمیں تو جلنا تھا ہم اپنی آگ میں جلتے
تمہاری یاد میں جلنا تو اِک بہانہ ہوا
برے بھلے سبھی مجھ کو عزیز ہیں نصرت
کہ سب سے درد کے رشتے سے دوستانہ ہوا

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

سفینے باندھ کے رکھتا ہوں میں دریچوں سے　　کہ میرے صحن سے دریا گزرتے رہتے ہیں

آصف ثاقب نے ماہیے سناتی ہواؤں، پامال راستوں اور پیڑوں کی سرگوشیوں، دریائے کنہار کی لہروں اور روئے آب پر جمی کائی کے دکھوں کو اپنے شعری وسائل میں آمیخت کر کے ایک ایسے نادر اسلوب کی طرح ڈالی ہے جس کی تقلید ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ انہوں نے خاموشی سے اُردو زبان وادب کی خدمت کی اور ایک عہد کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ اپنے آنسوؤں کے چراغ جلا کر اسے راستہ بھی دکھایا۔ اس درویش شاعر کا اوّلین مجموعہ کلام ایک عجیب عالم سرشاری میں، اس یقین کے ساتھ اُردو دنیا کے سامنے پیش کیا جارہا ہے کہ آنسوؤں کی زبان سمجھنے والے خدوخال ہی سہی لیکن موجود ضرور ہیں۔ (احمد حسین مجاہد)

بیٹھے بیٹھے خوابوں میں اب دل ہے بن کے باسی کا
چاروں اور ہیں میلے ٹھیلے، گزرا دور اُداسی کا
پھول پرندے چہکیں مہکیں، ان میں خوشیاں بانٹ گئے
پکھلی اور کاغان کے منظر، جھونکا پیر چناسی کا
شاخِ صنوبر چاند کو لے کر صحن میں جلوہ آرا ہے
رات چھما چھم ناچ رہی ہے کام یہی ہے داسی کا
اس کا سرگم درد جگر میں ایک قیامت بھر جائے
گھول رہا ہے رس کانوں میں نغمہ چڑیا پیاسی کا
نثر میں اِک تاثیر دکھاؤ، نظم میں اک تنظیم کہو
شوق سے لکھنے پڑھنے میں ہے شیوہ حُسن شناسی کا
مجھ کو دیکھو پتا پتا بوٹا بوٹا پڑھتا ہوں
سارا جیون بیت گیا ہے بن میں اس سنیاسی کا

میری حالت کا کیا ہو اندازہ
شعر کوئی نہیں ہوا تازہ
اس کی صورت کھلی ہے بارش میں
کیسے چہرے سے دُھل گیا غازہ
تم ہو حُسن گماں مصور کے
میں ہوں صرفِ نظر کا خمیازہ
غیر حالت پہ لوگ کیا کہتے
بھائی کستا ہے مجھ پہ آوازہ
چور رستہ تلاش کرتا ہوں
کوئی کھولے نہ گھر کا دروازہ

میں نے کاغذ بہت سنبھالے تھے
اب بکھرنے لگا ہے شیرازہ
لمس خوبی سے ہو گیا ثاقب
اپنے ہونے کا مجھ کو اندازہ

جہازیوں کو ہلاکت بھنور سے آتی ہے
بھنور کی چشم رقابت کدھر سے آتی ہے
بچھڑ کے اپنے وطن سے میں سو نہیں سکتا
دُکھی دُعاؤں کی آواز گھر سے آتی ہے
جوار ہجر میں شہنائیاں سی بجتی ہیں
یہ کیسی لہر مری چشم تر سے آتی ہے
راہِ راست کوئی گفتگو نہیں ہوتی
خبر تمہاری یہاں نامہ بر سے آتی ہے
پناہ لینے کو آتی ہے میری کٹیا میں
خبر نہیں یہ ہوا کس کے ڈر سے آتی ہے
میں زخم کھا کے اسی سوچ میں ہوں گم ثاقب
چلا ہے تیر کہ رنجش اُدھر سے آتی ہے

یہ خشک پتے تو گھر میں بکھرتے رہتے ہیں
فلک سے مجھ پہ صحیفے اُترتے رہتے ہیں
سفینے باندھ کے رکھتا ہوں میں دریچوں سے
کہ میرے صحن سے دریا گزرتے رہتے ہیں
وہ ہنستے کھیلتے رہتے ہیں غیر لوگوں سے
پر اپنے گھر کے مکینوں سے ڈرتے رہتے ہیں
وہ شخص میری وفاؤں کو یاد کیا رکھتا
یہ واقعات تو اکثر بسرتے رہتے ہیں
غموں کی شعر میں تجسیم ہوتی رہتی ہے
لہو کے رنگ سے پیکر سنورتے رہتے ہیں
کوئی بھی ڈر نہیں ان کے مزاج کا ثاقب
ہوا و موج تو ایسے بپھرتے رہتے ہیں

جو اچھے شعر کا ارمان رکھیں
سرہانے میر کا دیوان رکھیں
کبھی سامان ہوگا زندگی کا
مکاں میں ہم یہی امکان رکھیں
نہ ہوں بے زار وہ انسانیت سے
کسی انسان کو پہچان رکھیں
ہمارے پاس رہنے دیں فقیری
وہ اپنے پاس جھوٹی شان رکھیں
سحر کی روشنی اوڑھیں گے کیسے
شب غم ہی کی چادر تان رکھیں
محبت دوستوں کی اس قدر ہے
ہم اپنی جان کو ہلکان رکھیں
ہمارے گھر میں کون آتا ہے ثاقب
بس اپنی جان کو مہمان رکھیں

علی رضا/ساہیوال

کون آیا تھا مرے خیمہ ادراک کے بیچ
کس کے سانسوں کی مہک ہے مری پوشاک کے بیچ

علی رضا غزل کے کلچر میں پوری طرح بھیگا ہوا شاعر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کلاسیکی غزل کا اہم ترین موضوع، طالب اور مطلوب کا وہ سلسلہ شوق ہے جس کے تحت طالب، پروانے کی طرح شمع کے گرد طواف کرتا ہے اور شمع، پروانے کی دیوانگی سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان زمانہ ہے جو دریا کی طرح دونوں کناروں (طالب اور مطلوب) کے ربط باہم کو قائم رکھتا ہے۔ کبھی وصال کے حوالے سے اور کبھی جدائی کے حوالے سے! گویا زمانہ، ان دونوں کے راستے میں حائل بھی ہے اور ان کے عشق کو قائم رکھنے میں معاون بھی۔ علی رضا کی غزل میں، غزل کے یہ تہذیبی کردار، ایک ایسی تثلیث بناتے ہیں جس میں جذبہ پرفشاں ہو کر احساس میں ڈھلتا ہے اور ایک ایسی مہکار کو جنم دیتا ہے جو غزل پڑھنے والوں کو بہا لے جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ علی رضا کی غزل میں سلسلہ شوق کے وہ لطیف پیرایے مزید اُبھریں گے جو محبت کو غم کے آفاقی دیار سے ہم رشتہ کر کے، ایک نہایت ارفع سطح تفویض کرتے ہیں اور پورا عالم جڑ کر ایک اکائی میں ڈھلتے ہوئے دکھائی دینے لگتا ہے! (ڈاکٹر وزیر آغا)

عجب تقاضے ہیں چاہت کے کاروبار کے بھی
میں مطمئن نہ ہوا اُس پہ جان وار کے بھی

تڑپ تو جاتا ہے انسان، مر نہیں جاتا
تمہارے ہجر میں دیکھے ہیں دن گزار کے بھی

گزرتی ہے جو مرے دل پہ دل ہی جانتا ہے
عجب طرح کے ہیں دن کربِ انتظار کے بھی

نظر اُٹھا کے بھی دیکھوں گا میں نہ اب اُس کو
وہ خال و خد کو اگر آئے گا سنوار کے بھی

تو اپنے خاک نشینوں کی زندگی کو تو دیکھ
انا کے بوجھ کو سر سے کبھی اُتار کے بھی

اُداس رکھتے ہیں یہ بھی خزاں رُتوں کی طرح
بہت قریب سے دیکھے ہیں دن بہار کے بھی

اُدھر چلے ہو تو کہنا مری طرف سے اُسے
کہ جی رہا ہے رضا زندگی سے ہار کے بھی

جو ہوا ہے، وہ دوبارہ نہیں ہونے والا
چاہتا ہوں مگر ایسا نہیں ہونے والا

ہر گھڑی جگمگاتے رہتے ہیں تری یادوں کے
میں اکیلے میں بھی تنہا نہیں ہونے والا

تپش دل نے عجب آگ لگا رکھی ہے
یعنی تادیر تماشا نہیں ہونے الا

اس زمانے سے وفا کی ہے توقع تجھ کو
یہ زمانہ تو کسی کا نہیں ہونے والا

تو کیا جان بھی ہم تجھ پہ نچھاور کرتے
تیری جانب سے اشارہ نہیں ہونے والا

یوں بجھائے ہوئے بیٹھا ہوں اُمیدوں کے دیے
کیا شبِ غم کا سویرا نہیں ہونے والا

اس نگر میں بھی سبھی نام و نسب دیکھتے ہیں
اس نگر میں بھی گزارا نہیں ہونے والا

ہائے وہ بات بنائے سے جو بنتی ہی نہیں
ہائے یہ دل جو ہمارا نہیں ہونے والا

اشکِ خوں آنکھ تک آتا ہے تو رُک جاتا ہے
یہ وہ قطرہ ہے جو دریا نہیں ہونے والا

ہجر کے کرب نے جس دُکھ سے نوازا ہے رضا
میرے اُس دکھ کا مداوا نہیں ہونے والا

کون آیا تھا مرے خیمہ ادراک کے بیچ
کس کے سانسوں کی مہک ہے مری پوشاک کے بیچ

میرے ہمراہ روانہ ہیں زمانوں کے ہجوم
میں اکیلا تو نہیں وسعتِ افلاک کے بیچ

یہیں جینا، یہیں مرنا مری مجبوری ہے
میری خوشیاں، مرے آنسو ہیں اسی خاک کے بیچ

ایک طوفاں ہے جسے ٹھہرے ہوئے عمر ہوئی
غور سے دیکھ مرے دیدۂ نم ناک کے بیچ

بے خیالی میں کبھی دھیان نہ آیا جس کا
اِک نگینہ سا نہاں تھا خس و خاشاک کے بیچ

ورنہ کیا تھا، یونہی آوارہ تھے ہم شاخ بہ شاخ
اپنی قسمت کھلی آ کر ترے فتراک کے بیچ

ایک اُلجھن ہے جو حل ہو نہیں پاتی مجھ سے
اِک معما ہے مرے اور دلِ بے باک کے بیچ

جانے اعجاز یہ مٹی کا ہے یا پانی کا
آئی تاثیر کہاں سے یہ رگِ تاک کے بیچ

اب جسے پاؤں تلے روندتا پھرتا ہوں رضا
کل سما جانا ہے چپ چاپ اسی خاک کے بیچ

کچھ ربط زمانے سے زیادہ نہیں رکھتا
میں اپنے سوا اپنا حوالہ نہیں رکھتا

ہاتھوں میں تو آ جاتی ہے دل میں نہیں آتی
دُنیا کی طرح میں غمِ دُنیا نہیں رکھتا

آنکھوں سے برسنے پہ جب آ جائے ترا درد
یہ ابر بچا کر کوئی قطرہ نہیں رکھتا

جز تیرے پکاروں میں کسے اور کہ میں تو
جز تیرے کوئی اور وسیلہ نہیں رکھتا

صد حیف کہ تو اُس سے بھی ہر بات چھپائے
جو تجھ سے کسی بات کا پردہ نہیں رکھتا

وہ حرص جو انسان کو بنا دے سگِ دُنیا
صد شکر کہ میں سر میں وہ سودا نہیں رکھتا

لوگوں کو دُعا دیتا گزر جاؤں رضا روز
ہاتھوں میں گدائی کا میں کاسہ نہیں رکھتا

شہزاد نیّر /گوجرانوالہ

چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے — اُس نے انسان کو اس درجہ کشادہ باندھا

شہزاد نیر سنجیدہ ادبی حلقوں میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ وہ گزشتہ تین دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ کم لکھا اچھا لکھا کی مصداق انہوں نے منتخب شاعری نذرِ قارئین کی ہے۔ اُن کے شعری مجموعے ''برفاب'' اور ''چاک سے اُترے وجود'' نہایت اہم ہیں۔ اچھے غزل گو ہونے کے باوجود انہوں نے کمال کی نظمیں لکھی ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر شعراء میں ہردلعزیز ہیں۔ سینئر اُن کا اعتراف کرتے جبکہ جونیئر اُن کی محبت کا دم بھرتے نظر آتے ہیں۔ ادبی میدان میں بہت سی کامیابیاں شہزاد نیر کی منتظر ہیں۔ (ارژنگ)

جب بھی چپکے سے نکلنے کا ارادہ باندھا
مجھ کو حالات نے پہلے سے زیادہ باندھا
چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اُس نے انسان کو اس درجہ کشادہ باندھا
کتنی بھی تیز ہوئی حرص و ہوس کی آندھی
ہم نے اِک تارِ توکل سے لبادہ باندھا
یک بہ یک جلوۂ تازہ نے قدم روک لیے
میں نے جس آن پلٹنے کا ارادہ باندھا
تو نے سامان میں جب باندھ ہی دی تھی منزل
کس لیے یار! مرے پاؤں میں جادہ باندھا
اُس نے دل باندھ کے اِک آن میں بازی جیتی
ہم تو سمجھے تھے، فقط ایک پیادہ باندھا
سادگی حُسن کی شعروں میں بیاں کرنی تھی
لفظ آسان چنے، مصرعۂ سادہ باندھا

مہ و نجوم کا ملبہ بدن پہ آن گرا
کوئی طناب کٹی تھی کہ آسمان گرا
ہزار ہاتھ فضا میں علم بنائیں گے
مرے غنیم! سنبھل کر مرا نشان گرا
جنون و عقل کی کیسی عجب لڑائی تھی
نظر بچا کے میں دونوں کے درمیان گرا
فلک نشین تو زوروں سے کھینچتا تھا مجھے
میں خود ہی گرتا گراتا زمیں پہ آن گرا
سروں پہ دُھوپ اُٹھائے یہاں تک آئے تھے
قدم جمے بھی نہیں تھے کہ سائبان گرا
تمہارے ہجر کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہی
مرے بدن کا لرزتا ہوا مکان گرا
اُدھر دُعا کو اُٹھائے ہوئے وہ ہاتھ گرے
اِدھر وجود کی کشتی کا بادبان گرا

موجہ سیلابِ غم، عزم جوانی لے گیا
آنکھ میں جو خواب تھے نمکین پانی لے گیا
خود فراموشی کا ریلا پہلے بھی آیا مگر
اب کے جو آیا تو سب یادیں پرانی لے گیا
تیرے میرے درمیاں جو مدتوں حائل رہی
ایک ہی آنسو، بہا کر، بدگمانی لے گیا
صورتِ ہمدرد جو آیا، کہانی کار تھا
چند آنسو دے کے وہ میری کہانی لے گیا
میری چوکھٹ پر سمندر آ گیا تھا ایک دن
میرے دل سے مانگ کر دہ بے کرانی لے گیا

کیسے ہوا میں پار، کہاں جانتے ہو تم
اے ساحلوں کے یار، کہاں جانتے ہو تم
آتا ہے کون آنکھ میں آنسو کے رُوپ میں
اے میرے رازدار، کہاں جانتے ہو تم
ہستی کے آسمان سے تو ڈوبتا ہوں میں
اب ہوں گا آشکار کہاں، جانتے ہو تم
تم لذتِ وصال ہی میں خرچ ہو گئے
وہ لطفِ انتظار، کہاں جانتے ہو تم
کربِ شکستِ ذات سے دل ٹوٹتا ہے کیا
تم حسن پائیدار، کہاں جانتے ہو تم
ہر شام بحرِ ہوش کی لہروں سے کھیلتے
جانتے ہیں بادہ خوار کہاں، جانتے ہو تم؟
نیر سنو! تم اِک تو خسارہ نصیب ہو
پھر دل کے کاروبار کہاں جانتے ہو تم

سوچوں کو منجدھار کیا، خود کو پتوار کیا
دل کا دریا پار کیا اور پہلی بار کیا
ہجر کی پہلی شام پڑے دو بھاری کام پڑے
اُس کو بھی تیار کیا، دل بھی تیار کیا
قطرہ قطرہ جھیل بنیں پھر آنکھیں نیل بنیں
مجھ کو بہتی دھار کیا، ساون کی تار کیا
دل کی سبتک آگ ہوئی، جاں دیپک راگ ہوئی
شعلوں سا اظہار کیا، لہجہ انگار کیا
دشمن کی پہچان کہاں پھر اس کا دھیان کہاں
اندھوں کو سالار کیا، بے دیکھے وار کیا
جانے کیسے دیس گئے، تم کیوں پردیس گئے
کیا میرے دلدار کیا، ساون بے کار کیا
نیر جگ کی باتوں سے، خود اپنے ہاتھوں سے
ہر رستا دیوار کیا، جینا دُشوار کیا

اختر رضا سلیمی/اسلام آباد

کچھ اس لیے بھی ترے حسن سے گریز کیا　　کہ ٹوٹ سکتا ہے آئنہ دیکھ بھال سے بھی

......میں اسے اختصار پسندی نہیں حُسنِ ایجاد کہوں گا جو اختر رضا سلیمی کی غزل کی سب سے نمایاں صفت ہے۔شعر کے حسن کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں ایک جہانِ معنی آباد کر دینا، ہنر اور ریاضت سے زیادہ وجدان کی ثمر آوری اور بصیرت کا محتاج ہے۔اختراع اور اس کے بعد کی غزلوں میں شاعر نے جس حسنِ ایجاز کا کمال کر دکھایا ہے وہ بہت ہی کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔
(آفتاب اقبال شمیم)

اسی لیے تو جھجکتی ہے ہاتھ آتے ہوئے
دھنک نے دیکھ لیا تھا اُسے نہاتے ہوئے
نجانے کون سی گلیوں میں چھوڑ آیا ہوں
چراغ جلتے ہوئے، خواب مسکراتے ہوئے
انہی کو کرنی ہے تنظیم گردشِ دوراں
جو ہاتھ کانپ رہے ہیں سبو اُٹھاتے ہوئے
پھر اس کے بعد سمٹنے میں ایک عمر لگی
بکھر گئے تھے ترا نقش پا اُٹھاتے ہوئے
یہ کیسی خاک سے میرا خمیر اُٹھایا گیا
کہ آگ سبز ہوئی جاتی ہے جلاتے ہوئے
نجانے کتنے گماں، کتنے خواب، کتنے یقیں
بھٹک گئے ہیں مجھے راستہ دکھاتے ہوئے
یہ رنگ و نور کا قصہ وہیں ہوا آغاز
جب اس نے دیکھا تھا مجھ کو نظر چراتے ہوئے
نکھر گئے ہیں رضا سارے رنگ سارے حروف
کسی بدن کی کھنک کو سخن بناتے ہوئے

دل و نگاہ پہ طاری رہے فسوں اُس کا
تمہارا ہو کے بھی ممکن ہے میں رہوں اُس کا
زمیں کی خاک تو کب کی اُڑا چکے ہیں ہم
ہماری زد میں ہے اب چرخِ نیلگوں اُس کا
تجھے خبر نہیں اس بات کی ابھی شاید
کہ تیرا ہو تو گیا ہوں مگر میں ہوں اُس کا
ہے اس سے قطعِ تعلق میں بہتری ہے مری
میں اپنا رہ نہیں سکتا اگر رہوں اس کا
دلِ تباہ کی دھڑکن بتا رہی ہے رضا
یہیں کہیں پہ ہے وہ شہرِ پرسکوں اُس کا

دیکھو! یہ دیکھنا بھی کہیں رائگاں نہ ہو
جس پر نظر ہے مرتکز اُس کا نشاں نہ ہو
ممکن ہے ایک روز ملیں اس طرح بھی ہم
دیوار کوئی وصل کی بھی درمیاں نہ ہو
شاید بدل لیا ہے بہاروں نے پیرہن
جس کو خزاں سمجھ رہے ہو وہ خزاں نہ ہو
ممکن ہے ایک وہم ہو بود و نبود بھی
ممکن ہے سب فریب ہو کچھ بھی یہاں نہ ہو
ایسا نہ ہو وہاں سے مری واپسی تلک
اس گردِ ماہ و سال کا نام و نشاں نہ ہو
اختر غزل میں کتنی سہولت سے ڈھل گیا
وہ دکھ جو گفتگو میں کسی سے بیاں نہ ہو

لطیف تر ہے وہ باریکیٔ خیال سے بھی
سمجھ میں آتا نہیں ہے کسی مثال سے بھی
مقامِ جذب کی اِک ایسی انتہا پہ ہے دل
کہ اب تو ہوتا نہیں مطمئن وصال سے بھی
کچھ اس لیے بھی ترے حُسن سے گریز کیا
کہ ٹوٹ سکتا ہے آئینہ دیکھ بھال سے بھی
دلِ شکستہ سے کب کا نکل چکا ہے تو
نکل ہی جائے گا اِک دن مرے خیال سے بھی
کبھی کبھار تو اختر نکل ہی آتا ہے
نشاط کا کوئی پہلو کسی ملال سے بھی

درِ امکان وا ہونے سے پہلے
خدا کیا تھا خدا ہونے سے پہلے
یہاں اب کچھ نہیں ہے ہونے والا
یہاں سب ہو چکا، ہونے سے پہلے
غبارِ رائگانی میں گھرا تھا
میں تجھ سے آشنا ہونے سے پہلے
اندھیرا ٹمٹماتا تھا وہاں پر
ستارہ رونما ہونے سے پہلے
تب و تابِ گماں پر مر مٹا تھا
یقیں میں مبتلا ہونے سے پہلے
کہیں ملنے کی حسرت رہ نہ جائے
چلو مل لیں جدا ہونے سے پہلے

تمہارے ہاتھ سے نکلا نہیں ہوں
میں لمحہ ہوں مگر گزرا نہیں ہوں
مجھے بھی ہونے کا اِک وہم سا ہے
جو تو کہتا ہے تو "اچھا نہیں ہوں"
خیالِ رفتگاں گھیرے ہوئے ہے
میں تنہا ہو کے بھی تنہا نہیں ہوں
میں اپنے کھوج میں نکلا تھا سائیں
زمانہ ہو گیا پلٹا نہیں ہوں
ہر اِک سے کھل کے ملتا ہوں میں لیکن
کسی بھی شخص پر کھلتا نہیں ہوں
کوئی آئینہ رُو ہو تو بتائے
کہیں موجود بھی ہوں یا نہیں ہوں

شہاب صفدر/ اسلام آباد

شہاب صفدر کئی شعری مجموعوں کے خالق اور نہایت پختہ کار شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک زمانہ معترف ہے۔ زندگی اور کائنات سے متعلق اُن کا مشاہدہ وسیع ہے۔ انہوں نے غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اُس کی تازگی اور بانکپن میں اضافہ ہی کیا ہے۔ اُن کی شاعری ماضی، حال اور مستقبل کی آئینہ دار ہے۔

تھا دل کو ذوقِ زخم شماری، نہیں رہا
اہلِ نظر کا فیض تھا، جاری نہیں رہا
مارے جو تم نے پھول لگے صبر آزما
اب کوئی وار دوستو کاری نہیں رہا
بہر وداع آ گئے احبابِ جاں سپار
جاں دادگی کا مرحلہ بھاری نہیں رہا
رہوار تازہ دم انہیں درکار تھے سو میں
آئندہ کے غموں کی سواری نہیں رہا
گویا نہیں رہا میں خلا میں زیادہ دیر
تسخیرِ مہ کا نشہ سا طاری نہیں رہا
ایسا نہ تھا معاملہ ناقابلِ گرفت
افسوس دسترس میں ہماری نہیں رہا
عشق اب کھلی کتاب کی صورت سہی شہاب
لیکن کوئی کتاب کا قاری نہیں رہا

بچانے کے لیے لفظوں کی حرمت جیتے مرتے تھے
سنا ہے سادہ ان پڑھ لوگ جو کہتے کرتے تھے
عجب دن تھے کسی کو مبتلائے درد پاتے تو
ہمیں بھی درد ہوتا اور ہم بھی آہ بھرتے تھے
بساطِ سوگ پر گھمسان سا رہتا تھا یادوں میں
کھڑی فصلیں، کچلتے روندتے، لشکر گزرتے تھے
پلوں کے نیچے سے پانی گزرتا دیکھتے ہیں اب
یہی دریا تھا اور اِک لہر میں ہم پار اُترتے تھے
کسی کو روزی روٹی چاہے جتنی دور لے جاتی
بھلائے بھولتے میلے نہ بیتے پل بسرتے تھے
بہت اُونچا اُڑاتے جھولنے آموں کے باغوں کے
جواں جذبے رُتوں کے بور سے بنتے سنورتے تھے
شہاب اِک دوسرے سے جوڑے رکھتیں عیدیں شبراتیں
محرم پتی پتی کچی قبروں پر بکھرتے تھے

دل سے ہارا، زمانے سے بھی رہ گیا
وہ کہیں آنے جانے سے بھی رہ گیا
کر نہ پایا سفر دور کے چاند تک
اور پرندہ ٹھکانے سے بھی رہ گیا
آیا تھا تیرہ بختی مٹانے مگر
مشتری جگمگانے سے بھی رہ گیا
خواب تھا دوسروں کا سہارا بنوں
بوجھ اپنا اُٹھانے سے بھی رہ گیا
زندگی بھر کے آرام کی فکر میں
ایک دو پل کمانے سے بھی رہ گیا
ذات میں کر دیا بند پہچان نے
کھل کے دُکھ سکھ سنانے سے بھی رہ گیا
رونا آتا ہے ہم کو یہ سن کر شہاب
اب تو ہنسنے ہنسانے سے بھی رہ گیا

ایک دم توڑتی خواہش نے کوئی بات کہی
درد نے تھاما قلم، تازہ غزل رات کہی
آپ سے رابطہ اب میرا فقط یاد کا ہے
ان کہی، اُس نے یہ لہراتے ہوئے ہاتھ، کہی
گزری باتوں کا مزا لینے کہیں بیٹھ گئے
چائے کہتے ہوئے، کچھ کھانے کی شے ساتھ کہی
کلۂ کوہ سے چکرا کے گرا گھاٹی میں
سر پھرے جھونکے نے مجھ سے مری اوقات کہی
زندہ کردار مگر اصل سے بے بہرہ نہیں
داستاں گو نے تو درپردۂ حالات کہی
اُس کو پامال شدہ جذبوں نے کیا کہنا تھا
جیت کی ہانک پہ خاموشی نے شہ مات کہی
تمتماتا ہے ہر اِک غنچے کا رُخسار شہاب
گُل نے ہم رازوں سے کیا بعد ملاقات کہی

کوشش سے یا نصیب سے لاحق رہے ہمیں
کچھ غم بہت عجیب سے لاحق رہے ہمیں
اُن کے سبب دوا نے کیا کام زہر کا
اندوہ جو طبیب سے لاحق رہے ہمیں
پگڈنڈیوں سی تنگ تھی جب تک رہِ حیات
اندیشے بھی غریب سے لاحق رہے ہمیں
کہنے کو یار دوست رہے حال پوچھتے
اور واعظ و خطیب سے لاحق رہے ہمیں
خواہش تو تھی کہ شعر و ادب حرزِ جاں کہیں
پھر شاعر و ادیب سے لاحق رہے ہمیں
مانندِ یوسف اپنا بھی دامن ہے تار تار
معشوق تو رقیب سے لاحق رہے ہمیں
اُتنے ہی جان و دل کے مقرب ہوئے شہاب
دُکھ جس قدر قریب سے لاحق رہے ہمیں

سعید عاصم / بھکر

بخش دے گی آگ کی حدت اُسے عمر طویل — ورنہ جو کچھ بن رہا ہے چاک پر مٹی کا ہے

سعید عاصم محبت کر گزرنے والا انسان ہے۔ اس جذبے کے تقاضوں پر مر مٹنے کے لیے ہر وقت بے چین رہنے والا۔ اُس کی محبت کا تعلق فردِ واحد سے ہوتا ہوا وطن اور ابنائے وطن تک وسیع ہو چکا ہے۔ اُس نے نہایت خوبصورتی اور بے حد سہولت کے ساتھ غمِ محبت کے مشرقین اور غمِ روزگار کے مغربین کے اتصال کو ممکن بنا دیا ہے۔ اُس کے یہاں استحصال زدہ طبقوں کے مصائب و آلام کا بیان بھی ہے جو کسی ترقی پسندانہ شعری ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ایک فریضے کی انجام دہی کے طور پر ہے۔ سعید عاصم بورژوا اور پرولتاریہ کے درمیان حائل طبقاتی خلیج کا مکمل شعور رکھتا ہے اور اُسے پاٹنے کے لیے قلم کے محاذ پر محروم طبقوں کی جدوجہد میں شریک و متحرک ہے۔ (اقبال حسین)

یہ جہانِ دیدہ و دل سر بہ سر مٹی کا ہے
یعنی جو کچھ ہے مرے پیش نظر مٹی کا ہے
جب یہ طے ہے ایک دن سب کچھ فنا ہو جائے گا
پھر محل ہو یا کوئی مٹی کا گھر، مٹی کا ہے
میری محنت بھی مرے فن کی معاون ہے مگر
میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارا ثمر مٹی کا ہے
بخش دے گی آگ کی حدت اُسے عمر طویل
ورنہ جو کچھ بن رہا ہے چاک پر مٹی کا ہے
دشمنوں کو بھی مرا سوز و گداز اچھا لگے
میرے اندازِ سخن میں یہ اثر مٹی کا ہے
زندگی کے مجھ پہ جتنے قرض ہیں اُن میں سعید
اس قدر کوئی نہیں جس قدر مٹی کا ہے

فصیل جسم سے باہر کبھی نہیں آتا
ندی کی سمت سمندر کبھی نہیں آتا
یہ دورِ ظلم و ستم کیسے ختم ہو کہ یہاں
ستم کی زد میں ستم گر کبھی نہیں آتا
عجب ہے طرزِ حکومت کہ اب خلیفہ وقت
گلی میں بھیس بدل کر کبھی نہیں آتا
سفر میں پیش اگر کوئی مشکل آ جائے
نجات کے لیے رہبر کبھی نہیں آتا
ثمر شجر پہ نہ ہونے کا فائدہ یہ ہے
کہ گھر کے صحن میں پتھر کبھی نہیں آتا
سعید میں وہ گدا ہوں جو بھیک کی خاطر
امیر شہر کے در پر کبھی نہیں آتا

چند لمحوں میں کہاں کوئی ہنر ملتا ہے
پر نکل آئیں تو پھر اذنِ سفر ملتا ہے
کتنا مشکل ہے لحد کا بھی میسر آنا
زندگی ختم اگر ہو تو یہ گھر ملتا ہے
سیپیاں چننے تو سب لوگ چلے جاتے ہیں
خوش نصیبوں کو مگر اُن سے گوہر ملتا ہے
راہ تکتے ہوئے تھک جاتی ہیں آنکھیں اکثر
نخل اُمید جواں ہو تو ثمر ملتا ہے
خشک ٹکڑوں پہ بھی زندہ ہیں بہت لوگ یہاں
ہر جفاکش کو کہاں لقمۂ تر ملتا ہے
آج یوں مجھ سے ملا ہے وہ سر راہ سعید
جیسے مفلس سے کوئی صاحب زر ملتا ہے

عدو کے خوف سے بھاگا نہیں ہوں
میں ٹوٹا ہوں مگر بکھرا نہیں ہوں
کہیں یہ ضبط میری جاں نہ لے لے
بہت عرصہ ہوا رویا نہیں ہوں
اگرچہ خاک سے وابستگی ہے
مگر مضبوط ہوں کچا نہیں ہوں
مرے اس حال پر حیران کیوں ہو
میں جیسا پہلے تھا ویسا نہیں ہوں
تمہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے
بچھڑ کر تم سے افسردہ نہیں ہوں
خدا کا شکر ہے اُس کے علاوہ
کسی کے سامنے جھکتا نہیں ہوں

موسم کی جبیں زیر شکن دیکھ رہا ہوں
طوفان کا رُخ سوئے چمن دیکھ رہا ہوں
محروم ہیں بلبل کے ترانوں سے نشیمن
افسردہ سبھی سرو و سمن دیکھ رہا ہوں
ہر کوچہ و بازار ہے بارُود کی زد میں
ہر شخص کے ہاتھوں میں کفن دیکھ رہا ہوں
حیرت ہے کہ اس دورِ پر آشوب میں بھی میں
خاموش سبھی اہل سخن دیکھ رہا ہوں
قانون کی دہلیز پہ زردار کے ہاتھوں
مزدور کا لٹتا ہوا دھن دیکھ رہا ہوں
اِک جشن بپا ہے سر محفل اعدا
مغموم سعید اہل وطن دیکھ رہا ہوں

ارشد شاہین/لاہور

عشق اذیت ناک بھی ہے اور صبر طلب بھی
لیکن اس سے آدمی تازہ دم رہتا ہے

ارشد شاہین ''ارتقا اور ممتا'' کی ایک ''نادر ترکیب'' کا حامل مردِ خدا ہے۔ اس کی شاعری اسی ''نادر ترکیب'' کا جداگانہ اظہار ہے اور اس کے اشعار واقعتاً ایک مردِ خدا کی دُعا کا اثر رکھتے ہیں۔ کاش! اس بستی میں شعروادب کا چرچا ہوتا اور اب تک اس بستی کے تنِ مردہ میں جان پڑ سکتی۔ کاش یہ شعروادب سے بےگانہ بستی جان سکتی کہ وہ کن لوگوں کے لیے دن کالے اور راتیں سفید کرتا رہا ہے۔ وہ انہیں جھنجھوڑ کر جگانا نہیں چاہتا۔ وہ تو ان کے دکھوں پر پگھل پگھل جاتا ہے اور اس کے آنسوؤں کا دریا خدائے واحد کی بارگاہ میں ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے۔ مگر کوئی اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ نہیں کرتا کہ اس کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ اس بستی کے باسیوں کے دل تبدیل ہو گئے ہیں اور زندگی ڈھرے پر آنے لگی ہے۔ وہ بستی چھوڑ کر جا رہا ہے تا کہ اس بستی کے لیے نئے خواب لا سکے اور اس بستی کے باسی ان کی ''تعبیر'' کے لیے گھروں سے نکل سکیں اور یہ بستی ارتقا آشنا ہو سکے! آمین (خالد احمد)

بگڑے ہیں کہاں یوں ہی خدوخال ہمارے
چہروں پہ اُبھر آئے ہیں اعمال ہمارے
لگتا ہے کہیں ہم سے کوئی بھول ہوئی ہے
رہتے ہیں تعاقب میں جو بھونچال ہمارے
اِک عمر محبت کی تمازت میں کٹی ہے
کب یوں ہی شفق رنگ ہوئے گال ہمارے
کچھ ہاتھ نہ آ پائے گا جز گردِ ندامت
گزرے جو اسی طور مہ و سال ہمارے
خوش رنگ فضاؤں کا سفر کرتے رہیں گے
جب تک کہ سلامت ہیں پر و بال ہمارے
غیروں کی طرح تم تو نہ تشنیع کرو اب
تم پر تو عیاں ہیں سبھی احوال ہمارے
اس پہر سے گزرے ہیں کہ مدت تلک ارشد
ملتے نظر آتے نہیں سر تال ہمارے

چھن گئی مجھ سے کج کلاہی بھی
کام آئی نہ بادشاہی بھی
خلقتِ شہر کے ہیں سب درپے
حاکمِ وقت بھی، سپاہی بھی
تیری ہر ہر ادا قیامت خیز
یہ تلطف بھی، کم نگاہی بھی
تجھ سے ملنا، جدا بھی ہونا تھا
تھی مقدر میں رُو سیاہی بھی
اس قدر خوف ہے فضاؤں میں
سہمے سہمے ہیں مرغ و ماہی بھی
جگ میں تو معتبر ہوں میں لیکن
چاہیے آپ کی گواہی بھی
عجز کرتا ہے سر بلند ارشد
ہے فقیری میں شانِ شاہی بھی

یہ جو میری آنکھ میں اکثر نم رہتا ہے
پیش نظر ہمیشہ ایک ہی غم رہتا ہے
تیرے بعد سنبھل تو جاتی ہے پر کچھ دن
دوست! طبیعت میں اِک زیر و بم رہتا ہے
عشق اذیت ناک بھی ہے اور صبر طلب بھی
لیکن اس سے آدمی تازہ دم رہتا ہے
باہر کچھ بھی موسم ہو اب شام سویرے
دل میں تیری یاد کا ہی موسم رہتا ہے
عشق میں چپ سی لگ جاتی ہے ان ہونٹوں کو
اور سرِ تسلیم ہمیشہ خم رہتا ہے
اس درجہ مصروف ہوئے کارِ دُنیا میں
اب تو اپنا دھیان بھی ارشد کم رہتا ہے

تحیر اِک عجیب سا سوادِ جاں میں چھا گیا
وہ شخص ہر قدم نئی قیامتیں اُٹھا گیا
بہار کی مثال تھا خیالِ یار بھی مجھے
حریم جسم و جان میں گلاب سے کھلا گیا
عجیب شخص تھا مرے وجود سے کٹا ہوا
جدا ہوا تو درمیاں کے فاصلے مٹا گیا
وصال کی گھڑی میں شب عجب سکوت تھا کہ بس
نہ اُس نے کوئی بات کی، نہ مجھ سے کچھ کہا گیا
فضائے قلب و ذہن میں ہوائے تازہ چل پڑی
مہک اُٹھا ہے تن بدن، یہ کون یاد آ گیا

کوئی خواہش نئی، خیال نیا
پھر کوئی راستہ نکال نیا
کاٹ دیتا ہوں شام ہوتے ہی
روز بنتا ہوں ایک جال نیا
زندگی اس طرح گزاری ہے
ہر قدم، ہر گھڑی وبال نیا
روز کرتا ہے لاجواب مجھے
روز کرتا ہے وہ سوال نیا
مدتیں ہو گئیں تجھے دیکھے
کوئی لمحہ، کبھی اُجال نیا
غم کو مہمیز پھر سے دے ارشد
روگ سینے میں کوئی پال نیا

احمد خیال/خوشاب

کوئی بھی واقعہ جو مرے ساتھ پیش آئے
صدیوں پرانے عہد کا قصہ نکلتا ہے

احمد خیال پر غزل مہربان ہے۔ وہ غزل نہیں لکھتا کائنات تسخیر کرتا ہے۔ وہ ایک جنگجو اور بہادر ہیرو کی طرح اپنی غزل کے شہر شعر میں نظر آتا ہے۔ ''ناممکن'' اور ''نہیں'' جیسے مایوس کن الفاظ اُس کی ڈائری اور شاعری میں نہیں۔ وہ غزل کیا مکمل کرتا ہے ایک تیر کھینچ کے مارتا ہے، جس کا سیدھا سیدھا نشانہ قاری کے دل پر لگتا ہے اور وہ احمد خیال کی شاعری کا اسیر ہو جاتا ہے۔ احمد خیال جدید دور کے شعرا میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کی شاعری کا اعتراف اس دور کے بڑے بڑے ناقدین فن کر چکے ہیں۔

بستی سے چند روز کنارہ کروں گا میں
وحشت کو جا کے دشت میں مارا کروں گا میں
ویسے تو یہ زمین مرے خواب سی نہیں
لیکن اب اس کے ساتھ گزارا کروں گا میں
شاید کہ اس سے مردہ سمندر میں جان آئے
صحرا میں کشتیوں کو اتارا کروں گا میں
منظر کا رنگ رنگ نگاہوں میں آئے گا
اک ایسے زاویے سے نظارہ کروں گا میں
اے مہرباں اجل مجھے کچھ وقت چاہیے
جب جی بھرا تو تم کو اشارہ کروں گا میں

چند خستہ سے در و دیوار بھی موجود تھے
تھوڑے تھوڑے شہر کے آثار بھی موجود تھے
اس کا چہرہ پھول ہے یا پھول جیسا اس لیے
تتلیوں کے غول اب کی بار بھی موجود تھے
آنکھ بھر کے دیکھا تھا اپنا سراپا یار نے
عکس اس کے آئینے کے پار بھی موجود تھے
حسن کی وارفتگی میں ہاتھ چھلنی ہو گئے
گل بھری اس شاخ پر کچھ خار بھی موجود تھے
میں بہت حیران ہوں، کیسے وہاں سے بچ گیا
تیغ بھی موجود تھی اور یار بھی موجود تھے

قیامت سی، قیامت سے گزارے جا رہے تھے
یہ کن ہاتھوں ہزاروں لوگ مارے جا رہے تھے
زمانوں سے عجب سر میں پکارے جا رہے تھے
جواں، کوہ ندا پر جان وارے جا رہے تھے
سنہری جل پری دیکھی تو پھر پانی میں کودے
وگرنہ ہم تو دریا کے کنارے جا رہے تھے
سمندر ایک قطرے میں سمیٹا جا رہا تھا
شتر سوئی کے ناکے سے گزارے جا رہے تھے
چمن زاروں میں خیمہ زن تھے صحراؤں کے باسی
ہرے منظر نگاہوں میں اتارے جا رہے تھے
سبھی تالاب پھولوں اور کرنوں سے بھرے تھے
بدن خوش رنگ پانی میں نکھارے جا رہے تھے

اور کب تک یوں تمہارے ناز اٹھانے چاہئیں
کچھ بتا اے زندگی، کتنے زمانے چاہئیں
میں نے کافی دیر تک آنکھوں سے چھوئی ہے دھنک
اب تو مجھ کو سات رنگے خواب آنے چاہئیں
راستے میں دشت ہے، کوزہ گروں کو رات بھر
جتنے ممکن ہو سکیں، کوزے بنانے چاہئیں
باغ میں وہ آ گیا تو زرد رُت کے باوجود
خار ہوتی ٹہنیوں پر پھول آنے چاہئیں
ایک دن رستہ بھٹک کر کشتیوں کے قافلے
اس زمیں سے دور افق کے پار جانے چاہئیں
جس کے دم سے زندگی تھی، اس کی رخصت کے سمے
ہونٹ تھوڑی دیر تک تو کپکپانے چاہئیں

چاروں طرف سے دشت کو رستہ نکلتا ہے
اس شہر کا جنون سے رشتہ نکلتا ہے
دن کو وہ آفتاب سے چھپتا ہے اور پھر
ٹھیک آدھی رات جسم سے سایہ نکلتا ہے
اک رت میں دشت ریت کی صورت اڑا پھرے
اک رت میں اپنی آنکھ سے دریا نکلتا ہے
صدیوں پرانی بات بھی بالکل نئی لگے
ہر بول اس زبان سے تازہ نکلتا ہے
بارش بھی کچھ تو زور سے پڑتی ہے اس گھڑی
کچھ پیرہن کا رنگ بھی کچا نکلتا ہے
کوئی بھی واقعہ جو مرے ساتھ پیش آئے
صدیوں پرانے عہد کا قصہ نکلتا ہے
لگتا ہے پوری قوم گداگر تھی اس طرف
کھودیں اگر زمین، تو کاسہ نکلتا ہے
آتی ہے کھل کے نیند، اگر اپنا دیس ہو
اور پھر وہاں پہ سانس بھی پورا نکلتا ہے

اسد اعوان/سرگودھا

خود بخود چھوڑ گئے ہیں تو چلو ٹھیک ہوا　　اتنے احباب کہاں ہم سے سنبھالے جاتے

پاکستانی ادبی ترقی میں اس وقت جو نوجوان شاعر دن رات کوشاں دکھائی دیتے ہیں ان میں اسد اعوان کا نام بھی نمایاں ہے۔ سرگودھا کی زرخیز زمین کا یہ شاعر بہت تھوڑے سے عرصہ میں بامِ شہرت پر قدم رکھ چکا ہے۔ اسد اعوان کا لہجہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اس میں ایک کسک ہے جو غزل کی آبیاری کرتی ہے۔ اس سوز، اس کسک کے بغیر غزل تازہ نہیں رہ سکتی۔ اسد اعوان کی توجہ تخلیقی کام پر زیادہ ہے۔ ''نہ اس طرح سے ملو'' کا جزوی مسودہ میرے سامنے آیا ہے تو اسے پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ ایک اور خدمتگار غزل کو مل گیا ہے۔ (باقی احمد پوری)

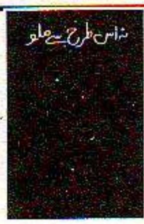

یہ الگ بات کہ ہم پیرہن خاک میں تھے
کل کئی جشن بپا کوچۂ چالاک میں تھے
ہر کوئی خلعتِ زرتار میں لپٹا تھا، مگر
عید کے روز بھی ہم جامۂ صد چاک میں تھے
اس قدر تیز ہواؤں نے بکھیرا ہے ہمیں
جیسے ہم لوگ بھی شامل خس و خاشاک میں تھے
خندقیں کھودی گئیں اور لڑائی نہ ہوئی
میرے اعداء بھی کہیں راہِ خطرناک میں تھے
کل شب تار میں شب خون ہوا ہے کوئی
کل ستارے بھی نہاں وسعتِ افلاک میں تھے
خوفِ رُسوائی اُسے ربط میں رہتا تھا مگر
کھل کے ملتا تھا مجھے حوصلے بے باک میں تھے
سامنے میرے حریفوں کے پڑاؤ تھے اسدؔ
اور احباب میرے پیچھے میری تاک میں تھے

ظلمت شب کے بہت دور حوالے جاتے
ہم کہاں ڈھونڈنے بے سود اُجالے جاتے
بے بصر لوگ اکٹھے تھے درِ جاناں پر
دیکھنے جاتے مگر دیکھنے والے جاتے
اچھا ہوتا جو زمانے کی طرح سوچتے ہم
روگ سینے میں محبت کے نہ پالے جاتے
خود بخود چھوڑ گئے ہیں تو چلو ٹھیک ہوا
اتنے احباب کہاں ہم سے سنبھالے جاتے
وہ جو آ جاتے ہمیں ملنے خوشی سے امشب
رات بھر ناچتے ہم جام اُچھالے جاتے
ہم بھی غالبؔ کی طرح کوچۂ جاناں سے اسدؔ
نہ نکلتے تو کسی روز نکالے جاتے

راستہ صاف نظر آتا ہے راہی تو نہیں
کچھ کہو راہِ محبت میں تباہی تو نہیں
میری آنکھوں میں تو آنسو ہیں مری حسرت کے
میری آنکھوں میں کسی شہر کی شاہی تو نہیں
منصفو دیکھو اُسے اور مجھے بھی دیکھو
اُس کی خاموشی مرے سچ کی گواہی تو نہیں
آج صحرا میں مجھے قتل کیا جائے گا
آج صحرا میں مرا کوئی سپاہی تو نہیں
ہر گھڑی دیکھتا رہتا ہے مجھے غرفہ سے
بخل رکھتا ہے کوئی نیک نگاہی تو نہیں
اُس سے کہنا یہ مری طرزِ نگارش ہے اسدؔ
خونِ دل صرف ہوا، صرف سیاہی تو نہیں

نہ پوچھ جادۂ سنگین سے گزرنا پڑا
مجھے بھی عہد جوانی میں عشق کرنا پڑا
دیارِ حُسن میں جینا ہے دوستو مجھ کو
اسی وجہ سے کسی خوبرو پہ مرنا پڑا
ستارا ڈوب گیا تھا مرے مقدر کا
سمندروں کی تہوں تک مجھے اُترنا پڑا
کوئی تو اب بھی فروکش ہے میرے سینے میں
مگر کسی کی جدائی کا زخم بھرنا پڑا
یہ اور بات اکٹھا نہ کر سکا مجھ کو
یہ اور بات کہ اُس کے لیے بکھرنا پڑا
تمام عمر کسی سے بھی وہ سنور نہ سکا
کسی کے واسطے جس شخص کو سنورنا پڑا
جو فیصلہ بھی ہوا ٹھیک ہو گیا ہے اسدؔ
اُسے بھی اور مجھے بھی قبول کرنا پڑا

حشر دیکھا ہے کہیں حشر بپا کر دیکھا
سوچتے ہیں کہ حسیناؤں نے کیا کر دیکھا
ہم نے یاروں کی جوانی کی طرف دیکھا، مگر
اپنی جانب تو جوانی کو لٹا کر دیکھا
ہم نے اس شہر کے لوگوں سے محبت کی ہے
ہم کو اِس شہر کے لوگوں نے رُلا کر دیکھا
یہ الگ بات کہ پھر رُوٹھ گیا ہے ہم سے
یہ الگ بات کہ پھر اُس کو منا کر دیکھا
خلقتِ شہر نے تو دُور سے دیکھا تھا اُسے
ہم نے اُس سانپ کو ہاتھوں پہ اُٹھا کر دیکھا
کچھ اثر بھی نہ ہوا، ہم نے کئی بار اسدؔ
قصۂ درد ستمگر کو سنا کر دیکھا

شبیر نازش/کراچی

میرے کفن کے بند نہ باندھو ابھی مجھے　　ملنا ہے ایک شخص سے بانہیں نکال کر

شبیر نازش کی شاعری ترنگ اور اُمنگ کی شاعری ہے۔اُس کی غزل کا لہجہ معذرت خواہانہ نہیں بلکہ دبنگ ہے۔وہ اظہار میں بے باک اور خوفناک ہے۔کوئی بھی مضمون ہو اُس کے خیال کی زبان پر آبلہ بن کر رہ نہیں جاتا بلکہ مکمل روانی سے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جاتا ہے۔ دیہات اور اُس کے بعد ایک بڑے شہر میں قیام کے مشاہدات و تجربات نے اُسے بہت کچھ سکھایا ہے۔وہ جدید غزل گو ہے اُس کی غزل آج کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی مستقبل کی طرف گامزن ہے۔

اپنی الگ ہی سمت میں راہیں نکال کر
وہ لے گیا ہے جسم سے سانسیں نکال کر
لوٹے تو یہ نہ سوچ کہ خط جھوٹ موٹ تھے
میں رکھ چلا ہوں بام پر آنکھیں نکال کر
میرے کفن کے بند نہ باندھو! ابھی مجھے
ملنا ہے ایک شخص سے بانہیں نکال کر
کیا ظرف ہے درخت کا، حیرت کی بات ہے
ملتا ہے پھر خزاں سے جو شاخیں نکال کر
تو ہی بتا! کہ آنکھ کے شمشان گھاٹ میں
کیسے بسالوں میں تجھے لاشیں نکال کر
ہر شخص اپنے قد کے برابر دکھائی دے
سوچیں جو درمیان سے ذاتیں نکال کر
چاہو تو کر لو شوق سے تم بھی حسابِ وصل
اک پل بچے گا ہجر کی راتیں نکال کر

چہرہ کوئی بھی آنکھ میں ٹھہرا نہ پھر کبھی
دل نے کسی بھی شخص کو چاہا نہ پھر کبھی
روٹھا ذرا سی بات پہ، اُٹھ کر چلا گیا
ایسا گیا کہ لوٹ کے آیا نہ پھر کبھی
کچھ یوں ملا تپاک سے، بس عشق ہو گیا
وہ اجنبی تھا، کون تھا؟ سوچا نہ پھر کبھی
اُس نے بطور تحفہ، دیا تھا لباسِ ہجر
پہنا جو ایک بار، اُتارا نہ پھر کبھی
دیکھے ضعیف کاندھوں پہ محنت کے جب نشاں
بچوں نے کچھ بھی باپ سے مانگا نہ پھر کبھی
دولت ملی تو چھن گئی احساس کی قبا
اُس نے مرا مزاج بھی پوچھا نہ پھر کبھی
نازشؔ گزر چکا تھا حدِ اعتدال سے
جانے کہاں گیا، اُسے دیکھا نہ پھر کبھی

سُنا کے رنج و الم مجھ کو اُلجھنوں میں نہ ڈال
تھکن کا خوف مرے عزم کی رگوں میں نہ ڈال
میں اِس جہان کو کچھ اور دینا چاہتا ہوں
تو کارِ وقت کے پُر ہول چکروں میں نہ ڈال
ملول دیکھ کے تجھ کو، میں رُک نہ جاؤں کہیں
خدارا! ہجر کی شدت کو آنسوؤں میں نہ ڈال
تری بھلائی کی خاطر مجھے اُتارا گیا
مجھے لپیٹ کے کپڑوں میں، طاقچوں میں نہ ڈال
یہ ہجرتیں تو مُقدر ہیں اور مشغلہ بھی
تو بے گھری کے حوالے سے وسوسوں میں نہ ڈال

جب اُس نے گفتگو ہی سے تاثیر کھینچ لی
میں نے بھی میل جول میں تاخیر کھینچ لی
پہلے تو میرے ہاتھ میں کشکول دے دیا
پھر یوں کیا کہ وقت نے تصویر کھینچ لی
میرے گناہ، کیا تری رحمت سے بڑھ گئے؟
پھر کیوں مری دعاؤں سے تاثیر کھینچ لی؟
دل نے ابھی لیا ہی تھا تازہ ہوا میں سانس
فوراً کسی نے پاؤں کی زنجیر کھینچ لی
اِک اختلافِ رائے پر، اِس درجہ برہمی
کیوں دوست تو نے ہجر کی شمشیر کھینچ لی؟

خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا
دل مکمل کبھی تسخیر نہیں ہو سکتا
آج روٹھے ہوئے ساجن نے بلایا ہے مجھے
آج تو کچھ بھی عناں گیر نہیں ہو سکتا
ہو نہ ہو یہ کوئی اپنا ہی کھلا ہے مجھ پر
میرے دشمن کا تو یہ تیر نہیں ہو سکتا
باندھ لے دوست! گرہ میں یہ مرا فرمایا
کچھ بھی کر لے تو، مگر میرؔ نہیں ہو سکتا
کربلا کے لئے مخصوص ہے بس ایک ہی شخص
دوسرا کوئی بھی شبیرؔ نہیں ہو سکتا

تو جو نظارہ کرے پستی کا
رنگ اُڑ جائے تری ہستی کا
تیرگی اور بڑھی آنکھوں کی
اِک چراغ اور بجھا بستی کا
عشق پر زور کہاں چلتا ہے
کب یہ سودا ہے زبردستی کا
داستاں بن کے رہا جاتا ہے
ایک اِک فرد مری بستی کا

اعجاز فیروز اعجاز/لاہور

بہت سے خواب ادھورے رہے زمانے میں
یہ زندگی ہے تو پھر زندگی کی بات کرو

شعروادب کے قاری کے لیے اعجاز فیروز اعجاز کا نام ہرگز اجنبی نہیں۔ وہ ایک عرصہ سے شعر کہہ رہا ہے۔ مجھے کئی بار مشاعروں میں اُس کا کلام سننے کا اتفاق ہوا۔ جو ادبی رسائل مجھ تک پہنچتے ہیں اُن میں بھی کبھی کبھار اعجاز کی شاعری پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ اُس کی غزل میں ایک رس ہے یہی وجہ ہے اب جب اُس نے اپنے تازہ شعری مجموعہ "سوچنا پڑے گا" کا مسودہ مجھے بغرض فلیپ دیا ہے تو دوران مطالعہ میں کسی غزل کو ادھورا چھوڑ کر آگے نہیں بڑھا۔ اعجاز فیروز اعجاز نیا اور منفرد لکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ گھسی پٹی زمینوں میں غزل کہنے کے بجائے اپنی منفرد زمینوں اور اچھوتی ردیفوں میں غزلیں تخلیق کرتا ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

ہمزاد کرو دل کی باتیں، شب مہکی ہے آنگن آنگن
جگنو ہیں، چاند ستارے ہیں، ماحول ہوا چندن چندن
یادوں کے دریچے کھلنے لگے، کچھ ایسے چلی ہے پروائی
بے تاب رگِ جاں کرنے لگی، بے چین ہوئی دھڑکن دھڑکن
آنکھوں سے لہو ٹپکے چھم چھم، پلکوں سے پیروں تک جائے
سینے سے نقش نہ مٹ پائے ہم ڈوب گئے گردن گردن
کچھ شعر فسانے بن جائیں، کچھ شعر ترانے بن جائیں
عنوان بھٹکتے رہتے ہیں، صحرا صحرا، گلشن گلشن
اعجاز تمہارے شعروں میں سب رنگ ملیں گے لوگوں کو
کچھ چاک گریباں کر دیں گے، کچھ تھامیں گے دامن دامن

بجلی، رنگ رنگیلی ملائم مسکراہٹ سے
لب و رُخسار کی رونق ہے قائم مسکراہٹ سے
گلوں نے خار کی ٹہنی پہ کھل کر یہ سکھایا ہے
مصیبت میں جواں رکھنا عزائم مسکراہٹ سے
حبیبو اور رقیبو مسکراؤ، نفرتیں چھوڑو
یہ ممکن ہے کہ مٹ جائیں جرائم مسکراہٹ سے
گل و گلزار و رنگ و نور میں جتنی ہے رنگینی
جہانِ رنگ و بو میں سب ہے قائم مسکراہٹ سے
محبت نام ہے قربانیوں کا، دردمندی کا
مگر اعجاز یہ ہوتا ہے دائم مسکراہٹ سے

شب ہجر کے ستارے مرے ساتھ جل رہے ہیں
میں سکوتِ شب سے پوچھوں، غم ماہتاب کیا ہے
کوئی پائے سب خدائی، کوئی پائے نارسائی
یہ نصیب کی ہیں باتیں، تو کسی کا خواب کیا ہے
وہ سزائیں دے رہا ہے، میں وفائیں گن رہا ہوں
کوئی سنگدل سے پوچھے، حد احتساب کیا ہے
مرے سامنے ہے جنگل، مرے پیچھے ایک صحرا
مجھے عشق پوچھتا ہے، ترا انتخاب کیا ہے
مرے پاؤں میں ہیں چھالے، میں تلاشِ گمشدہ ہوں
مجھے گردشیں بتائیں کہ یہ انتساب کیا ہے
کوئی معجزہ دکھائے، نہ خلش مجھے بتائے
مجھے رتجگوں نے بخشی، جو شبِ عذاب کیا ہے

فریب لطف سہی، بے خودی کی بات کرو
کوئی فسانہ سناؤ، کسی کی بات کرو
بہت سے خواب ادھورے رہے زمانے میں
یہ زندگی ہے تو پھر زندگی کی بات کرو
خیال و خواب کے منظر بدلتے رہتے ہیں
بدل کے سوچ کا رُخ، راستی کی بات کرو
اندھیری رات اُجالے کا پیش خیمہ ہے
زوالِ شب کے لیے روشنی کی بات کرو
مرے خیال میں ماضی ہے مرغِ دست آموز
اسیر وقت کسی اجنبی کی بات کرو
چراغِ چرخِ چہارم ہے معتبر اعجاز
یہی چراغ جلاؤ، خوشی کی بات کرو

کسی وجود کا جیسے ہی انتقال ہوا
خوشی کے ساتھ کسی غم کا احتمال ہوا
نہ عقل و فہم و فراست، نہ ذوقِ علم و ہنر
زوالِ فکر سے اندیشہ زوال ہوا
جہانِ فکر و عمل میں تضاد کا دُکھ ہے
فریب ذات ہمارے لیے وبال ہوا
زمیں کی گود میں بیٹھے، فلک کی سوچ میں گم
بشر کی ذات کا محور کوئی سوال ہوا
سرابِ شوق تماشا بنا گیا اعجاز
چناں چہ عالم رُخصت بھی پرملال ہوا

مری دھڑکنوں میں برپا، رُخِ انقلاب کیا ہے
رگِ جاں سے پوچھتا ہوں، پسِ اضطراب کیا ہے

سب سے جدا ہے تتلیوں کا انداز
بادِ صبا ہے تتلیوں کا انداز
چھونے سے ان کے رنگ پڑ جائیں ماند
رنگِ حنا ہے تتلیوں کا انداز
ان کے پروں کی شوخیاں دیدہ زیب
کیسا کھلا ہے تتلیوں کا انداز
ہو جائے خوش، ہو جائے یہ دل شاداب
جب دیکھتا ہے تتلیوں کا انداز
بچپن سے ہے وابستگی کا احساس
کیا دلربا ہے تتلیوں کا انداز
اعجاز ہے اُجڑے چمن کا بھید
ہم سے خفا ہے تتلیوں کا انداز

راشدامین/(برمنگھم-انگلینڈ)   باغ میں جس کی مرضی جیسا پھول لگائے   میں تو مٹی بھر کے گملے چھوڑ آیا ہوں

راشدامین کی غزلیں میں نے بار بار پڑھی ہیں۔ ہر بار تازگی اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو کیوں کہ اس نے شاعری کے میدان میں اپنا خیمہ سب سے الگ تھلگ جو لگایا ہوا ہے۔ راشدامین کی شاعری پاکستان کی مٹی کی خوشبو میں گندھی ہوئی ہے۔ وہ لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب جانتا ہے۔ اس کی شاعری میں دیہات کے شب وروز اپنی تمام تر رعنائیوں، خوبصورتی اور تازگی کے ساتھ سانس لیتے ہیں۔ کہیں چوپال لگی ہے تو کہیں پیڑوں میں چڑیا چہچہارہی ہے۔ کہیں میلے میں جٹی رقص کرتی ہے تو کہیں بیلوں کی دوڑ جاری ہے۔ کہیں ڈھولا گاؤں چھوڑ کر بس میں شہر جارہا ہے تو کہیں آنکھوں میں دور تک انتظار کی فصل لہلہارہی ہے۔ اس کی شاعری میں کہیں بھی زندگی ساکن نہیں۔ راشدامین کی جس طرح تمام زندگی انفرادیت پسند ہے اسی طرح اس کی شاعری کے موضوعات بھی منفرد ہیں۔ اس نے اپنے لیے مشکل راستے کا انتخاب کیا ہے مگر وہ اس پر اب تک ثابت قدمی سے چل رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد اس منزل کو پالے گا جس کے لیے اُس نے یہ سفر اختیار کیا ہے۔'' (حسن عباسی)

مرنا سمجھتے ہیں ابھی جینا سمجھتے ہیں
زنجیر زن ہیں خون پسینہ سمجھتے ہیں
اُترے ہیں جو حضور پہ غارِ حرا کے بیچ
وہ حرف لوگ سینہ بہ سینہ سمجھتے ہیں
زہرا جو تیرے درد میں گرتے ہیں آنکھ سے
ہم ایسے آنسوؤں کو نگینہ سمجھتے ہیں
دس دن نہیں اُترتے ہیں پانی کے گھاٹ پر
پنچھی بھی کربلا کا مہینہ سمجھتے ہیں
جس شہر لوگ اُٹھتے ہیں پہلی اذان پر
ہم پھو واس اس کو مدینہ سمجھتے ہیں
جو منہ پہ کوئی اور ہو پیچھے سے کوئی اور
ہم ایسے آدمی کو کمینہ سمجھتے ہیں

پتھر پڑے ہوئے کہیں رستہ بنا ہوا
ہاتھوں میں تیرے گاؤں کا نقشہ بنا ہوا
آنکھوں کی آبجو کے کنارے کسی کا عکس
پانی میں لگ رہا ہے پرندہ بنا ہوا
صحرا کی گرم دھوپ میں باغِ بہشت ہے
تنکوں سے تیرے ہاتھ کا پنکھا بنا ہوا
صندل کے عطر میں تری مہندی گندھی ہوئی
سونے کی تار سے مرا سہرا بنا ہوا

یادوں سے لے رہا ہوں حنائی مہک کا لطف
ٹیبل پہ رکھ کے لونگ کا قہوہ بنا ہوا
میلے میں ناچتی ہوئی جٹی کے رقص پر
یاروں کے درمیان ہے جھگڑا بنا ہوا

گھگھو گھوڑے ڈھولے ماہیے چھوڑ آیا ہوں
رزق کی خاطر کتنے رشتے چھوڑ آیا ہوں
دونوں آنکھیں قید نہ کر لے شہر کی رونق
اسی لیے تو گاؤں میں بچے چھوڑ آیا ہوں
سٹوں پر چڑیوں کا لشکر وار نہ کر دے
کھیتوں میں لکڑی کے باوے چھوڑ آیا ہوں
باغ میں جس کی مرضی جیسا پھول لگائے
میں تو مٹی بھر کر گملے چھوڑ آیا ہوں
شہر کی ہر چوکھٹ پر اب ہجرت سے پہلے
آزادی کا پرچم نعرے چھوڑ آیا ہوں

شجر کو شاید کسی مسافر کی بددُعا ہے
نہ پھول پھل ہیں نہ کوئی چڑیوں کا گھونسلہ ہے
بغیر چپو کے چل رہی ہے اگر یہ کشتی
اُچھلتے پانی کا ساحلوں سے معاہدہ ہے

ابھی تو مرضی کئی دنوں تک چلے گی تیری
ابھی تو تجھ پر مجھے کسی کا مغالطہ ہے
مجھے محبت میں اب یقیناً شکست ہوگی
تری دُعاؤں پہ سب نے آمین کہہ دیا ہے
کہیں کھجوریں کہیں پہ پانی کہیں پہ لاشیں
لہو کی تاریخ میرا البم بنا ہوا ہے

کسی نے باندھا ہے ایسا حصار کمرے میں
جو کھینچتا ہے مجھے بار بار کمرے میں
جلاتا رہتا ہوں کچھ دیپ کچھ اگربتیاں
بنا لیا ہے خود اپنا مزار کمرے میں
میں اپنی مرضی سے روتا ہوں اور ہنستا ہوں
ہر ایک بات کا ہے اختیار کمرے میں
نئی سفیدی ہے دیوار پر مکاں کی مگر
دکھائی دیتا ہے گرد و غبار کمرے میں
کوئی ہمارے لیے بھی ہے منتظر باہر
کوئی لگاتا رہا اشتہار کمرے میں
یہ جانتا ہے کہ میں باغ میں نہ آؤں گا
وہ بھیج دیتا ہے پھولوں کا ہار کمرے میں

سیّد کامی شاہ/کراچی

وہ مری دوسری محبت تھی　　کاش میں دوسرا نہیں ہوتا

کامی شاہ کا دوسرا نام اگر محبت رکھ دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ مگر یہ محبت عمومی نہیں خصوصی ہے۔ اس کا متحرک اور بے چین وجود اسے ہر لمحہ نئی دنیا کی تلاش پر اُکساتا ہے اور یہی اضطراب کوئی راہ نہ پا کر اشعار میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ خواب بنتا ہے، خواب دیکھتا ہے اور اس کو زندگی کا حاصل کہتا ہے۔ اسی لیے اس کی شاعری میں پرچھائیاں، نیلاہٹیں، دھندلکا اور حسن کا وفور ہے۔ کامی شاہ کا پہلا شعری مجموعہ "تجھ بن ذات ادھوری ہے" جدید اُردو شاعری کا ذوق وشوق رکھنے والوں کے لیے تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے۔

(کاشف حسین غائر)

اِک نئے مسئلے سے نکلے ہیں
یہ جو کچھ راستے سے نکلے ہیں
کاغذی ہیں یہ جتنے پیراہن
ایک ہی سلسلے سے نکلے ہیں
ہم جو نکلے ہیں بھیس بدلے ہوئے
تو کسی آئینے سے نکلے ہیں
لے اُڑا ہے ترا خیال ہمیں
اور ہم قافلے سے نکلے ہیں
یاد رہتے ہیں اب جو کام ہمیں
یہ اُسے بھولنے سے نکلے ہیں

میں جو تم سے ملا نہیں ہوتا
تو نیا سلسلہ نہیں ہوتا
وہ مری دوسری محبت تھی
کاش میں دوسرا نہیں ہوتا
ہم بھی وحشت نشیں نہیں ہوتے
وہ جو صحرا نما نہیں ہوتا
عمر بھر لاپتہ ہی رہتا ہے
آدمی کا پتہ نہیں ہوتا
لوگ جیسا گمان کرتے ہیں
ایسا اکثر ہوا نہیں ہوتا
لوگ سجدوں میں سر پٹختے ہیں
اور سجدہ ادا نہیں ہوتا

یہ کوئی خواب دیکھتا ہوں میں
یا کسی خواب سے اُٹھا ہوں میں
دور تک پھیلتا گیا ہوں میں
بعد از کن کوئی صدا ہوں میں
اسم اور جسم کی حدوں کے بیچ
ایک ہنگامہ سا بپا ہوں میں
اب مجھے کوئی باندھ سکتا نہیں
خود پہ اتنا تو کھل گیا ہوں میں
شہر میں رنگ اور ہے میرا
دشت میں اور ہی ہوا ہوں میں
تم سمندر کی بات کرتے ہو
اس سے آگے کی سوچتا ہوں میں
خود ہی زیر و زبر لگائے ہیں
اور خود ہی کو پڑھ رہا ہوں میں
سازشی ہیں یہ سایہ و دیوار
ان کو صدیوں سے جانتا ہوں میں
سات گلیوں کے پار آ کے کھلا
وہ نہیں تھا جو ہو گیا ہوں میں
نت نئی صورتوں میں ڈھلتا ہوا
چاک پر گھومتا ہوا ہوں میں
حیرتوں کے جہاں سمیٹے ہوئے
اپنے اندر چھپا ہوا ہوں میں
چاند احوال جانتا ہے مرا
رات کے ساتھ جل رہا ہوں میں
میری پسلی سے تو بنی ہے اور
آب اور خاک سے بنا ہوں میں
اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر کامیؔ
ہفت افلاک دیکھتا ہوں میں

وہ علامت، وہ استعارہ بھی
وہ مرا چاند بھی، ستارہ بھی
بھید دریا نے ہی نہیں کھولے
بات کرتا ہے وہ کنارا بھی
جس نے بخشا ہے رنگ و نور اُسے
وہی پرسان ہے ہمارا بھی
منہ اُٹھا کر جو آن نکلے ہو
دشت نے کیا تمہیں پکارا بھی؟
وہ جو تقسیم کر گئے تھے ہمیں
وہی حالات ہیں دوبارہ بھی
مبتلا جس میں تم رہے ہو کبھی
اب وہی حال ہے ہمارا بھی

کامران اقبال اعظم خوش رو، وجیہہ، خوش خصال، خوبصورت قد و قامت کشادہ پیشانی، مرنجاں مرنج طبیعت، ذہانت سے روشن آنکھیں، انتہائی بردبار اور مخلص انسان ہیں۔ والدین اور برادران حضرات شعر و سخن کا ذوق و شوق رکھتے ہیں۔ اسی علمی، ادبی گھریلو فضا کی مہک نے ان کے دل و دماغ کو معطر اور روشن کر دیا۔ گورنمنٹ کالج سے فارغ التحصیل ہوئے تو کالج کے اعلیٰ تعلیمی ماحول نے ان کی شخصیت کو غزل ایسی نازک صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرنے کی صلاحیت کو جلا بخش دی تھی۔ یہ چراغ ایک مرتبہ روشن ہو جائے تو لحمہ بہ لحمہ اس کی ضیا اور شناخت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ اور بھرپور کوششوں میں اپنے جذبات و احساسات کو عمومی ڈگر سے ہٹ کر اچھوتے انداز سے شعر کا رُوپ عطا کر رہے ہیں۔ بلاشبہ ان کی غزل کی زبان سادگی، سچائی، دل کی گہرائی اور لہجے کی تازہ ترکھنک کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ انوکھی سوچ اور گہری فکر کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ غزلوں میں فہم و ادراک اور طبع آزمائی کے نمایاں جوہر دکھائیں گے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (محمد اقبال اختر)

جو پس منظر میں تھا وہ پیش منظر کی طرف ہے
نکل کے گھر سے بھی میرا سفر گھر کی طرف ہے
شکستِ فاش دینی ہے ہمیں اپنی اَنا کو
ہماری پیش قدمی اپنے لشکر کی طرف ہے
ستم یہ ہے کہ کرتا بھی نہیں شکوہ ستم کا
ستم سہہ کے بھی میرا دل ستمگر کی طرف ہے
ہمارے درد کا احساس اُس کو ہو بھی کیسے
جو ہم نے چوٹ کھائی ہے وہ اندر کی طرف ہے
میں سوؤں کس طرح کہ رات کی خاموشیوں کا
عجب سا شور ہے جو میرے بستر کی طرف ہے
مرے اپنے ہی آنسو مجھ کو لے ڈوبیں گے اِک دن
یہ وہ سیلاب ہے بہتا جو اندر کی طرف ہے
اگرچہ خوف آتا ہے مجھے پانی سے اعظم
مگر میرا سفر ہی اب سمندر کی طرف ہے
قلابازی لگی وہ کامران اقبال اعظم
جو پیروں کی طرف تھا اب مرے سر کی طرف ہے

نظر میں جب سے ترے خد و خال باندھے ہیں
غزل میں مَیں نے اچھوتے خیال باندھے ہیں
نہ جانے کون سا درپیش ہے سفر اِس بار
سبھی نے رختِ سفر میں سوال باندھے ہیں
مرے یہ عشق کی دُھن میں کہے ہوئے اشعار
وفا کے سر میں محبت کی تال باندھے ہیں
جسے بھی دیکھوں گریزاں ہے اس طرح مجھ سے
کہ جیسے میں نے لبوں پر سوال باندھے ہیں
اگر یہ عشق کو ضد ہے نچائے گا ہر پل
تو ہم بھی پیروں میں اپنے دھمال باندھے ہیں
گھٹائیں آج ہیں پھر سے سمٹ گئیں اعظم
پھر اُس نے آج بہت کس کے بال باندھے ہیں

حصارِ ذات میں چھپ چھپ کے مجرموں کی طرح
یہ عمر میں نے گزاری ہے قیدیوں کی طرح
میں جس جگہ سے چلا پھر وہیں پہ آ پہنچا
تمام راہ لگی مجھ کو دائروں کی طرح
وہ جس نے سونپا ہے مجھ کو بلندیوں کا سفر
اُسی نے کاٹ دیا ہے مجھے پروں کی طرح
نہ جانے چاند کو کس کی تلاش رہتی ہے
تمام رات بھٹکتا ہے بے گھروں کی طرح
وہ جس نے بخشا تھا اعزاز اپنی بانہوں کا
اُسی نے توڑ دیا مجھ کو چوڑیوں کی طرح
عجب طرح کا تعلق ہے زندگی سے مرا
نہ دوستوں کی طرح ہے نہ دشمنوں کی طرح
وہ پیش پیش تھا اعظم مری تباہی میں
جو روز ملتا رہا مجھ سے دوستوں کی طرح

اُس کو بھولا نہیں میں کھو کر بھی
ہو نہ پایا جو میرا ہو کر بھی
خاک رستوں کی اتنی چھانی ہے
اب تو لگتی نہیں ہے ٹھوکر بھی
خواب میں بھی سفر رہا جاری
میں کہ چلتا رہا ہوں سو کر بھی
بوجھ ہلکا نہیں ہوا دِل کا
اب تو میں تھک گیا ہوں رو کر بھی
عشق کی رائیگانیاں مت پوچھ
اس کو پایا نہ خود کو کھو کر بھی
دیکھ لے اب بھی جی رہا ہوں میں
زندگی تیرا بوجھ ڈھو کر بھی
ڈوب کر بھی یہی ہے غم مجھ کو
وہ تو خوش ہی نہیں ڈبو کر بھی
داغ دل کے مٹے نہیں اعظم
رات دن آنسوؤں سے دھو کر بھی
دل کہے صرف سوچ مت اعظم
کچھ جو کرنا ہے تو نے تو کر بھی

راؤ وحید اسد/ملتان

ہم آ پہنچے محبت بانٹنے شہروں سے جنگل تک　　　پرندے راز کی باتیں ہمارے ساتھ کرتے ہیں

راؤ وحید اسد سے پہلی ملاقات میں ہی میں اُس کے جلد پیڑ بن جانے کی صلاحیت سے آشنا ہو گیا تھا۔ ان دنوں اس کی شاعری کی شاخیں نئی نئی اُگ رہی تھیں اور اُن کی سبز رنگت اُس کے چہرے کی رنگت میں اُس وقت گھل مل جاتی جب وہ شعر سنا رہا ہوتا تھا۔ کبھی کبھار غزل سناتے ہوئے اُس کے ہونٹوں سے کوئی ادھ کھلا پھول میری جھولی میں آ گرتا تو مجھے نہایت خوشگوار حیرت ہوتی۔ پھر ایک وقت آ گیا کہ اُس کا بدن چٹخنے لگا اور وہ مجسم شاعری کے پیڑ کی شکل اختیار کر گیا۔ شاخوں پر بور آنے لگا اور آج اُس بور کا ثمر دیکھ کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ میرا دوست ہے اور دوستوں کی کامیابی اپنی کامیابی ہوتی ہے۔ اُمید ہے راؤ وحید کی شاعری آنے والے وقتوں میں بھی اسی طرح سر سبز رہے گی۔

تمہاری ذات کا حصہ بنا دیا گیا ہوں
اسی لیے تو میں تجھ سا بنا دیا گیا ہوں
کہاں وگرنہ اُترتی یہ برف بالوں میں
کسی کے غم میں میں بوڑھا بنا دیا گیا ہوں
عجیب ڈھب سے لکھا ہے مرے مصنف نے
میں ہاؤ ہو کا مقالہ بنا دیا گیا ہوں
بدن میں بھر کے مرے ریت نارسائی کی
میں دیکھ پیاس کا دریا بنا دیا گیا ہوں
سجا کے سر پہ مرے تاج آدمیت کا
مثالِ کعبہ و قبلہ بنا دیا گیا ہوں
عجیب شے ہے محبت کی سلطنت بھی اسد
غرورِ شاہ سے گریہ بنا دیا گیا ہوں

ہم اہلِ عشق ہیں ایسے محبت ذات کرتے ہیں
اسی میں دن گزرتا ہے اسی میں رات کرتے ہیں
پرندہ کہہ گیا ہے آخری یہ خشک جھیلوں سے
مجھے مجبور ہجرت پر مرے حالات کرتے ہیں
ہم آ پہنچے محبت بانٹتے شہروں سے جنگل تک
پرندے راز کی باتیں ہمارے ساتھ کرتے ہیں
نکل ہی آئے ہیں ہم جانب صحرا تو ڈر کیسا
چلو کچھ دیر روتے ہیں چلو برسات کرتے ہیں
سنا ہے چاند اُترا ہے سنہری جھیل پر امشب
چلو کچھ دیر ملتے ہیں چلو کچھ بات کرتے ہیں

دشت میں یونہی تو برسات نہیں ہونے کی
ساری دنیا تو ترے ساتھ نہیں ہونے کی
کھردرے جسم پہ ریشم کو پہن کر مرے دوست
ایسے اُونچی تو تری ذات نہیں ہونے کی
روز گرتی ہے مرے دل پہ تری یاد کی برف
آج کی شب پہ نئی بات نہیں ہونے کی
عشق کرنا ہے تو پھر گنج شکر جاؤ میاں!
بیٹھے بیٹھے تو کرامات نہیں ہونے کی
تجھ کو ڈس لیں نہ اندھیرے شب تنہائی کے
چاند پر چل کہ وہاں رات نہیں ہونے کی
مار سکتا ہے مجھے اپنے قبیلے کا ہی شخص
کسی دشمن سے مجھے مات نہیں ہونے کی
خشک ہوتی ہوئی جھیلوں سے پرندوں نے کہا
اب یہ لگتا ہے ملاقات نہیں ہونے کی

ایک طوفاں اُٹھا کے جاؤں گا
اب تجھے میں بھلا کے جاؤں گا
پھونک ڈالوں گا یاد کے پتے
دل کی بستی جلا کے جاؤں گا
تنگ کرتے ہیں تیرے خواب مجھے
ان سے دامن چھڑا کے جاؤں گا
یہ محبت مرا حوالہ ہے
میں محبت جگا کے جاؤں گا

جو بچے ہیں تمہاری یادوں کے
سب کبوتر اُڑا کے جاؤں گا
آج اپنی غزل کے مصرعے میں
تیری آنکھیں بنا کے جاؤں گا
بعد میرے مرا حوالہ ہو
نظم ایسی سنا کے جاؤں گا
جن کا مفہوم بس محبت ہو
لفظ ایسے اُگا کے جاؤں گا
شام، پیپل، کنواں، پرند اور تم
سارے منظر چرا کے جاؤں گا

ایسے عجیب وقت کے چکر میں آ گیا
دریا سے بچ کے نکلا سمندر میں آ گیا
اس ڈر سے ٹوٹ جائے نہ سپنوں کا یہ محل
شیشے کے گھر کو چھوڑ کر پتھر میں آ گیا
وہ کون سا ہے مہرہ ہماری شکست کا
یہ کون شاہِ عشق کے لشکر میں آ گیا
پانی میں بج رہی تھیں محبت کی پائلیں
جب چاند نیلی جھیل کے منظر میں آ گیا
کس سمت سے لگی ہے جلانے مجھے یہ آگ
یہ کون میرے سرو صنوبر میں آ گیا
نکلا جو گھر سے رات کو تنہائی ڈھونڈنے
جنگل مجھے ڈرانے برابر میں آ گیا

صائمہ ملک / گجرات

یہ سرد ہوا تو نہیں آتی ہوئی میں ہوں
اب تیرے رگ وپے میں سماتی ہوئی میں ہوں

صائمہ ملک کی شاعری حبس کے موسم میں دم گھٹ کر مرنے والی لڑکیوں کے جذبوں کی ترجمان ہے۔ جو حالات اُس کے اردگرد رونما ہوتے رہتے ہیں اُنہیں اپنی شاعری کا موضوع بناتی ہے اس لیے قاری صرف اُس کی شاعری سے حظ نہیں اُٹھاتا بلکہ سوچنے پر بھی مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ سوچ معاشرے میں مثبت تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ صائمہ نے ایک جینوئن تخلیق کار کی طرح معاشرے میں تبدیلی کے لیے ہاتھ میں خنجر نہیں اُٹھایا بلکہ لفظوں کے پھول پروئے ہیں۔ وہ امریکی شاعرہ سلویا پلاتھ کی طرح خودکشی کے ذہنی عارضہ میں مبتلا ہے نہ کسی کو مار کر خود مرنا چاہتی ہے بلکہ اپنے شعری اظہار میں تو وہ سانس بھی آہستہ لیتی ہے۔ کیونکہ جانتی ہے کہ شیشہ گری کا کام بہت نازک ہے۔ (حسن عباسی)

نہ دولت مانگتی ہوں میں نہ شہرت مانگتی ہوں
میں جب بھی مانگتی ہوں رب سے عزت مانگتی ہوں

مرا حق ہے کوئی خیرات تو ہرگز نہیں ہے
اگر میں اپنے حصے کی محبت مانگتی ہوں

اگر دُکھ دینے والے ہیں مجھے سب ہی یہاں پر
میں گھر میں چھپ کے رونے کی سہولت مانگتی ہوں

بہت دن جی لیا تیری غلامی میں مگر اب
میں اپنی زیست پر اپنی حکومت مانگتی ہوں

نجانے کیوں کسی کو یہ گوارا ہی نہیں ہے
اگر میں شعر کہنے کی اجازت مانگتی ہوں

ذرا طوفان تھم جائے سہارا دینے والے
چلی جاؤں گی بس تھوڑی سی مہلت مانگتی ہوں

مخالف اس لیے ہے صائمہ سارا زمانہ
میں لڑکی ہو کے جینے کی رعایت مانگتی ہوں

زباں پہ حرفِ شکایت میں لا نہیں سکتی
کہ بنتِ حوا ہوں کچھ بھی بتا نہیں سکتی

سیاہی میرے مقدر میں جو گندھی ہوئی ہے
میں اپنے نور سے اُس کو مٹا نہیں سکتی

گزار سکتی ہوں یہ عمر جاگ کر لیکن
نصیب سویا ہوا میں جگا نہیں سکتی

ازل سے موسموں کی زنجیر میرے قدموں میں
کسی صدی میں ترے پاس آ نہیں سکتی

زمین میرے خدا کی ہے پاؤں میرے ہیں
مگر میں مرضی سے ان کو اُٹھا نہیں سکتی

ہزار دُکھ ہیں جنہیں میں بھلا چکی ہوں مگر
ہزار دکھ ہیں جنہیں میں بھلا نہیں سکتی

یہ لوگ اس لیے ہنستے ہیں صائمہ مجھ پر
میں اشک آنکھوں میں اپنے چھپا نہیں سکتی

خفا تھی خود سے منانے کوئی چلا آیا
کہ میرے ناز اُٹھانے کوئی چلا آیا

بہت اُداس رہا کرتی تھی میں شام وسحر
پھر ایک روز ہنسانے کوئی چلا آیا

بھنور حیات کا مجھ کو ڈبونے والا تھا
کنارہ بن کے بچانے کوئی چلا آیا

مرے نصیب کا گلدان خالی خالی تھا
خوشی کے پھول سجانے کوئی چلا آیا

وفا کا عہد کسی اور نے کیا تھا مگر
وہ عہد مجھ سے نبھانے کوئی چلا آیا

کسی کی قید میں رہتی تھی صائمہ ہر پل
اُسے وہاں سے چھڑانے کوئی چلا آیا

ہجر اور اُداسی میں، لڑکیاں کہاں جائیں
آندھیوں کے موسم میں، تتلیاں کہاں جائیں

جن کے باپ کا سایا، اُن کے سر سے اُٹھ جائے
خواب دیکھنے والی، بیٹیاں کہاں جائیں

گھر کو جانے والے جب، راستوں میں کانٹے ہوں
پھول توڑنے والی، بچیاں کہاں جائیں

کوئی تو یہ بتلائے، نفرتوں کی بارش میں
کاغذی محبت کی، کشتیاں کہاں جائیں

صائمہ یہ دیواریں، جن کا اب مقدر ہیں
بند رہنے والی وہ کھڑکیاں کہاں جائیں

یہ سرد ہوا تو نہیں، آتی ہوئی میں ہوں
اب تیرے رگ وپے میں سماتی ہوئی میں ہوں

بادل کی طرح پیاس بڑھاتا ہوا تو ہے
بارش کی طرح آگ لگاتی ہوئی میں ہوں

سبزہ سا مرے صحن میں اُگتا ہوا تو ہے
شبنم کی طرح خود کو لٹاتی ہوئی میں ہوں

آئینے کی دیوار سا تو ہے مرے آگے
آئینے میں رُوپ اپنا سجاتی ہوئی میں ہوں

باغوں کی طرح مجھ میں یہ پھیلا ہوا تو ہے
کوئل کی طرح تجھ میں یہ گاتی ہوئی میں ہوں

چندا کی طرح مجھ میں سمایا ہوا تو ہے
جھیلوں کی طرح تجھ کو چھپاتی ہوئی میں ہوں

خاور نعیم بٹ/لاہور

شہر چھوڑا تو اُداسی ساتھ میرے چل پڑی — جلتے بجھتے سب چراغوں کا دُھواں اچھا لگا

خاور نعیم بٹ نوجوان شاعر ہے۔ ادبی دُنیا میں قدم رکھے ابھی اُسے تھوڑا عرصہ ہوا ہے۔ وہ انتہائی سادہ اور محبت کرنے والا شخص ہے۔ اُس کی شاعری بھی اُس کے جذبوں کی طرح سادہ اور اُس کی شخصیت کی طرح تروتازہ ہے۔ اُس کا پہلا شعری مجموعہ ''جب تم پاس ہوتے ہو'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کے مرتب کردہ چار شعری انتخاب ''مجھے اپنا بنا لو تم''، ''ترے دل میں ہی رہنا ہے''، ''اپنا خیال رکھنا'' اور ''تم میرے ہو'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان شعری انتخابوں میں اُس نے نوجوان شعراء کو متعارف کرانے کی سعی کی ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ (ارژنگ)

یہ زمیں اچھی لگی اور آسماں اچھا لگا
تم کو دیکھا تو مجھے سارا جہاں اچھا لگا
جھیل تھی کچھ کشتیاں تھیں اور میرے ساتھ تم
پانیوں میں چاند تاروں کا سماں اچھا لگا
تیری جانب قدم میں نے بڑھائے تو مجھے
راستہ ہر مہرباں، نامہرباں اچھا لگا
شہر چھوڑا تو اُداسی ساتھ میرے چل پڑی
جلتے بجھتے سب چراغوں کا دُھواں اچھا لگا
زخم جو دنیا نے دیکھے وہ تماشہ بن گئے
درد جو دل میں رہا میرے بھی ہاں اچھا لگا
میں نے پہنی جب سے وردی جسم پر خاورؔ نعیم
جو بھی کھایا اپنے سینے پر نشاں اچھا لگا

مسیحا بن بھلا کر دے
میرے حق میں دعا کر دے
زمانے میں نہیں دیکھی
عنایت تو وفا کر دے
کلائی پر سجا چوڑی
ہتھیلی پر حناء کر دے
ستارہ ہے گگن کا تو
مرے گھر بھی ضیا کر دے
چلا آ تو کسی شب بھی
اُداسی کو فنا کر دے
ترے دل میں رہوں گا میں
جدائی کو جدا کر دے
دکھوں کی دھوپ نکلی ہے
مرے سر پر رِدا کر دے
لہو چھالے اُگلتے ہیں
ملن خاورؔ عطا کر دے

ترا آسرا بنوں گا ترے ساتھ میں رہوں گا
ترے دکھ میں سب سہوں گا ترے ساتھ میں رہوں گا
کبھی زندگی کی ظلمت نہ ڈرا سکے گی تجھ کو
ترا میں دیا بنوں گا ترے ساتھ میں رہوں گا
تجھے کچھ نہ کہہ سکے گا کوئی اِک لفظ اب تو
کہ جہاں سے خود لڑوں گا ترے ساتھ میں رہوں گا
کوئی دشت ہو کہ دریا کوئی شہر ہو کہ صحرا
تجھے ہر جگہ ملوں گا ترے ساتھ میں رہوں گا
کسی ندیا جیسی تو ہے کسی میں کنارے جیسا
ترے ساتھ ساتھ رہوں گا ترے ساتھ میں رہوں گا
تجھے ایک پل اکیلا نہیں چھوڑنا ہے خاورؔ
ترے سنگ سنگ چلوں گا ترے ساتھ میں رہوں گا

مجھے اپنا بنا لو تم
کہیں دل میں چھپا لو تم
ذرا سی یہ جو دوری ہے
کبھی آ کر مٹا لو تم
ستاروں سا ترا دامن
قمر اس میں سجا لو تم
کبھی میرا پکڑ کر ہاتھ
قریں اپنے بٹھا لو تم
درینہ اِک یہ خواہش ہے
سرِ محفل بلا لو تم
کھلا برگِ گلاب پہ میں
چمن میں آؤ اُٹھا لو تم
محبت ہے مجھے تم سے
گلے مجھ کو لگا لو تم
زمانے کی گھٹاؤں میں
چراغ اپنا جلا لو تم
یہ میرا دل مری آنکھیں
یہاں پر گھر بنا لو تم
کرو نظرِ کرم اپنی
نگاہوں میں بسا لو تم
کہا جو ہے وفا میری
جہاں مرضی نبھا لو تم
بہت دن ہو گئے خاورؔ
ملو ہم سے دعا لو تم

امجد اقبال امجد/

وہ میرا ہے میں اُس کا ہوں موسم کا کیا دوش
یاد تو مجھ کو رکھے گی وہ بارش والی شام

امجد اقبال امجد نے ہجرت کا دُکھ سہا ہے۔ روزگار کے سلسلہ میں وہ طویل عرصہ سے دُبئی میں قیام پذیر ہے۔ ''ماں'' کی جدائی کا دُکھ اور ''وطن'' کی یاد یہ دو جذبے اُس کی شاعری میں بھی بہت توانا ہیں۔ امجد اقبال امجد ایک محبّ وطن ہے۔ پاکستان سے اُس کی والہانہ محبت اُس کے اشعار سے ہی نہیں بلکہ اُس کی باتوں اور آنکھوں سے بھی چھلکتی ہے۔ وطن عزیز کے دگرگوں حالات کی وجہ سے اُس کا دل ہر وقت درد اور آنکھیں اشکوں سے بھری رہتی ہیں۔ مگر وہ کسی صورت مایوس نہیں ہوتا اُس کے ہونٹوں پر وطن کی محبت کے گیت کبھی مرجھاتے نہیں ہیں۔ (حسن عباسی)

ذہن سے کیسے نکلے گی وہ بارش والی شام
یاد میں ہر دم گھومے گی وہ بارش والی شام
جس میں تیرے ساتھ نہایا تھا میں دیر تلک
مجھ کو جل تھل رکھے گی وہ بارش والی شام
بھیگی زُلفیں بھیگا آنچل اور شرمیلا پن
مجھ کو مار ہی ڈالے گی وہ بارش والی شام
دن وہ آخر کر دوں گا بس اتنا یاد رہے
ذہن سے جب بھی اُترے گی وہ بارش والی شام
وہ میرا ہے میں اس کا ہوں موسم کا کیا دوش
یاد تو مجھ کو رکھے گی وہ بارش والی شام

بیچ بھنور میں ناؤ کھڑی ہے
مشکل میں یہ جان پڑی ہے
تو ہی مالک لگا کنارے
رحمت سے اُمید بڑی ہے
لوگ یزید کی صورت والے
اُمت پھر نیزے پہ چڑھی ہے
دیکھو نہ یہ ہنستے چہرے
آنکھوں میں ساون کی جھڑی ہے
طارق ابن زیاد کہاں ہے
قوم پہ پھر مشکل کی گھڑی ہے

دستار سر سے اور وہ آنچل کدھر گئے
وہ لوگ کیا ہوئے وہ زمانے گزر گئے
مالا گلے میں ڈالی تھی رانجھے نے ہیر کے
آج اس لڑی کے سارے ہی موتی بکھر گئے
جن کے وجود ماضی کے روشن چراغ ہیں
وہ لعل کیا ہوئے، وہ جیالے کدھر گئے
موسم بہار جاتے ہی گلشن اُجڑ گیا
ایسی ہوا چلی کہ سبھی گل بکھر گئے
امجد وہ حال میرا جدائیوں نے کر دیا
مدت کے بعد یاروں نے دیکھا تو ڈر گئے

آج موسم پہ جیسے نکھار آ گیا
ایسا لگتا ہے رنگِ بہار آ گیا
راستے میں ہے اس کی سواری ابھی
اس کے آنے کا کیوں اعتبار آ گیا
اِک اُجالا نظر میں سمانے لگا
چاندنی میں دُھلا اِک سوار آ گیا
ان سے ملتے ہی سارے گلے دُھل گئے
جسم و جاں کو بھی جیسے قرار آ گیا
ان کے آنے سے دل کی کلی کھل گئی
بوٹے بوٹے پہ جیسے خمار آ گیا

حُسن والوں کے ہی زمانے ہیں
ان سے وابستہ سب فسانے ہیں
پیار میں جدتوں کی گنجائش
نئے انداز بھی نبھانے ہیں
زخم اِک جیسے سب نہیں ہوتے
کچھ چھپانے ہیں کچھ دکھانے ہیں
وہ سر شام گھر کو لوٹ آئیں
کانٹے رستے سے بھی اُٹھانے ہیں
ان کے آنے کا انتظار بھی ہے
راہ میں پھول بھی بچھانے ہیں

آپ اپنے ہی دشمن جاں ہیں
جانے ہم کس طرح کے انساں ہیں
ہم کو اپنا خیال رکھنا ہے
آپ اپنے دکھوں کا درماں ہیں
اجنبی لوگ ملنے آتے ہیں
کون ہیں اور کیوں مہرباں ہیں
دنیا آباد کر چکے ہیں مگر
منتظر اب بھی کچھ بیاباں ہیں
آپ منزل پہ آ چکے ہیں مگر
ہم ابھی راہ میں خراماں ہیں

متفرق غزلیات

ذہن کے گوشوں میں رہتا ہے وہ یادوں کی طرح
اور خیالوں میں در آتا ہے وہ خوابوں کی طرح
جانے کب تک لے یونہی انگڑائیاں میرا بدن
ٹوٹتا رہتا ہے یہ میرے ارادوں کی طرح
اِک دیا سا ٹمٹماتا ہے سر صحرائے وہم
ایک دریا ہے کہ بہتا ہے سرابوں کی طرح
ٹوٹتی ہیں خرمن جاں پہ مرے ہی بجلیاں
رنج ہیں میرے مقدر میں خرابوں کی طرح
جھیلتا ہوں دُکھ زمانے نے دیے ہیں جو مجھے
مسکرا لیتا ہوں میں پھر بھی بہاروں کی طرح
کاش چلتے راہ حق پر آج کے اہل خرد
جو ابھی روشن ہے منزل کے چراغوں کی طرح
اس سے آگے بھی گیا اِک بندۂ یزداں صفات
آج پہنچا ہے جہاں انساں عقابوں کی طرح

آفتاب راجا

اصل و اصول، لفظ و معانی عظیم ہے
اُردو ادب کی ساری کہانی عظیم ہے
ہر قوس حرف وصوت میں طوفاں ہیں موجزن
اس بحر بیکراں کی روانی عظیم ہے
کرتا ہے دور پیاس ہر اِک تشنہ کام کی
اس دشت بے کنار کا پانی عظیم ہے
لفظوں کے بست ودر میں چھپے ہیں جہاں کئی
اُردو کی استعدادِ بیانی عظیم ہے
اس کم سنی میں بھی ہے جوانوں سے ہم سری
اس کم سخن کا جوش و جوانی عظیم ہے
پنجاب، دہلی، لکھنوٴ، دکن میں تھا قیام
اُردو زباں کی نقل مکانی عظیم ہے
چاروں طرف تھی دھوم جب اُردو زبان کی
اک یاد اُن دنوں کی پرانی عظیم ہے
اُردو زباں ہے آج بھی دنیا میں سرخرو
گویانِ ریختہ کی نشانی عظیم ہے
اُردو لکھی ہے جن نے لہو تھوک تھوک کر
اُن شاعروں کی خون فشانی عظیم ہے
ہر ایک اس زباں کے قلمکار کو سلام!
ہر ایک اس زبان کا بانی عظیم ہے
اُردو کے ساتھ ہم بھی غضنفر ہیں چار سو
اے نقش فارسی! تیرا ثانی عظیم ہے

غضنفر عباس سیّد/ساہیوال

مجھ پہ بھی ناز اں خوش نصیبی ہو......!

کل مجھے ایک ایسا شخص ملا
خوش نصیبی کو ناز تھا جس پر
مجھ کو بتلا رہا تھا رات اُسے
کملی والے کا ہے ہوا دیدار
شکر کرتا تھا وہ ہزاروں بار
تھے تشکر کے اشک آنکھوں میں
اور خوشبو رچی تھی سانسوں میں
میری نظروں نے اُس کی آنکھوں کو
بڑھ کے دیوانہ وار چوم لیا
اس سعادت پہ ہی میں جھوم لیا
تب سے میں رشک کر رہا ہوں جلیل
کاش وہ میرے خواب میں آتے
سوئی قسمت مری جگا جاتے
مجھ کو بھی معتبر بنا جاتے
پھر یہ میں بھی غرور سے کہتا
مجھ پہ بھی ناز اں خوش نصیبی ہے......!

احمد جلیل/اوکاڑہ

مسافر

(سیاچن گلیشیر کے محاذ پر شہید ہونے والے جوانوں کے نام)

یہ سفر میں ہیں کیوں؟ منزلیں ہیں کہاں؟
اپنی حالت پہ گم سم ہیں حیران ہیں
ان کے ہونٹوں پہ فریاد ہے نوحہ خواں!
پانی مٹی ہوا کے زمانے گئے
آگ جل بجھ چکی
راکھ سرد ہوگئی
اب تو چاروں طرف برف ہی برف ہے
راستے برف سے اَٹ گئے ہیں سبھی
دیکھنے کو بہت خوبصورت ہے یہ
اندھا کر دینے والی چمک اس میں ہے
منجمد راستے جن کے دونوں طرف
برف کے پتھروں کے سوا کچھ نہیں
اُونچے نیچے پہاڑوں کے یہ سلسلے
دور سے خوبصورت دکھائی دیے
ان سے ملنے کی خاطر یہ آگے بڑھے
ٹھنڈکوں پر پھسلنے لگے ان کے تن
ان پہاڑوں میں تلوار کی کاٹ ہے
برف کے پتھروں کی سلگتی زباں
جن سے داغے گئے ان سبھوں کے بدن
اس سفیدے کے عالم کی ٹھنڈی چمک
ان کی آنکھوں کی جانب لپکتی رہی
ان کی نظروں میں سردی اُترتی گئی
درد پلکوں کے سائے میں پلتا رہا
ان کی بینائی آنکھوں میں جمنے لگی
ان سبھوں کے بدن
گرم و زندہ بدن

برف کے یخ تھپیڑوں سے پھٹنے لگے
ان کے ہر عضو سے خون رسنے لگا
اس لہو کی حرارت بھری ایک بوند
برف کی یخ زمیں پر تڑپنے لگی
پاش پاش ہو کے بکھرا ہوا وہ لہو
اِک شگاف اس زمیں میں بنا نہ سکا
چند لمحوں کی سردی میں گم ہو گیا
یہ بھٹکتے رہیں گے یونہی برف میں
ان ہی رستوں پہ زندہ رہیں گے مگر
ان پہاڑوں کی یہ سنگدل ڈھیریاں
خوں کی بوندوں سے جو نرم ہو نہ سکیں
راستے میں ہمیشہ ملیں گی انہیں
یہ سفر میں رہیں گے قیامت تلک
آنکھ جمتی ہوئی، جسم پھٹتے ہوئے
برف میں اپنا رستہ بناتے ہوئے
لڑکھڑاتے ہوئے، خوں بہاتے ہوئے
پانی مٹی ہوا کے زمانے گئے
آگ جل بجھ چکی
راکھ سرد ہو گئی
اب تو چاروں طرف برف ہی برف ہے

اُمِ سارہ/کراچی

جب پرکھ لے گا زمانے کی وہ سچائی کو
لوٹ کر آنا پڑے گا مرے ہر جائی کو
اِک سمندر ہے نہیں جس کا کنارا کوئی
کب کوئی ناپ سکا عشق کی گہرائی کو
کس طرح کا یہ تمدن ہے یہ کیسی تہذیب
جان کا خطرہ ہے خود بھائی سے اب بھائی کو
وہ یہ محسوس کرے گا کسی زندان میں ہے
شہر میں لائیں اگر ہم کسی صحرائی کو
ترا وعدہ نہ وفا ہوگا یہ معلوم بھی ہے
منتظر رہنا پڑے گا ترے سودائی کو

گل شاداب کی مانند رہے تو تازہ
دیں خراج آ کے بہاریں تری رعنائی کو
شادمانی کا جزیرہ میں سمجھ کر اُترا
رنج و غم آگے بڑھے میری پذیرائی کو
وقت آئے تو پہاڑ اس کا بنا دیتے ہیں
ورنہ خاطر میں نہیں لاتا کوئی رائی کو
کب تلک لوگوں کی نظروں سے بچائے رکھوں
زخم جو تو نے دیے میری شناسائی کو
کیسے دن میرے گزرتے ہیں میں کس حال میں ہوں
دیکھ لے آ کے کبھی اپنے تمنائی کو
کچھ تو میرے دلِ افسردہ کا ہو اس کو خیال
دور مجھ سے نہ رکھے اپنی مسیحائی کو
نوحہ غم ہو کہ ہو نغمہ شادی دونوں
آپ صانع نے عطا سر کیے شہنائی کو
ہر کوئی خود کو سمجھنے لگا عزمی لقمان
کون پوچھے گا یہاں آپ کی دانائی کو

عمران شاہ عزمی/خیر پور ٹامے والی

میرے آنگن میں پھر اُترا دسمبر
مجھے پھر کر گیا تنہا دسمبر
سلگتی لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں
نگارِ آب میں اُترا دسمبر
بہاروں میں چمن سنولا گیا ہے
کسی گلبن میں پھر ٹھہرا دسمبر
مرے دو بھائی رُخصت ہو گئے ہیں
میری آنکھوں میں پتھرایا دسمبر
شفق نے ماتمی ملبوس پہنا
مجھے لگتا ہے پھر آیا دسمبر
مجھے پھر صبر کی تلقین کر کے
گلے مل کے بہت رویا دسمبر
چراغِ آرزو پھر گل ہوا ہے
کنول کو دیکھ کے سہا دسمبر

ایم زیڈ کنول/لاہور

جس کا چہرہ گلاب جیسا ہے
اُس کا ملنا تو خواب جیسا ہے
بات کرتا ہوں اس لیے اُن کی
بات کرنا ثواب جیسا ہے
میرا جینا تری جدائی میں
اِک مسلسل عذاب جیسا ہے
حال اُس کا بھی آج کل یارو
دل خانہ خراب جیسا ہے
نشہ اُس کی نشیلی آنکھوں کا
سب سے اچھا شراب جیسا ہے
اے پیامؔ اُن کی چاہتوں کا پیام
چاہتوں کی کتاب جیسا ہے

ایم اقبال پیامؔ شجاع آبادی

کسک

ڈھلتی شام میں
تیری یاد کے کچھ آنسو
مری آنکھوں کی دہلیز پہ آ بیٹھے ہیں
اور میں ان کو چھپانے کی خاطر
ہتھیلیوں کی پشت سے
پونچھنا چاہتی ہوں مگر
وہ تو اتر سے بہتے جا رہے ہیں
یہ دکھ اندر کے دکھ
سمندر کیوں کر دیتے ہیں
کبھی آ ؤ نا، سمجھاؤ نا

نسیم سکینہ/سیالکوٹ

تبصرۂ کتب

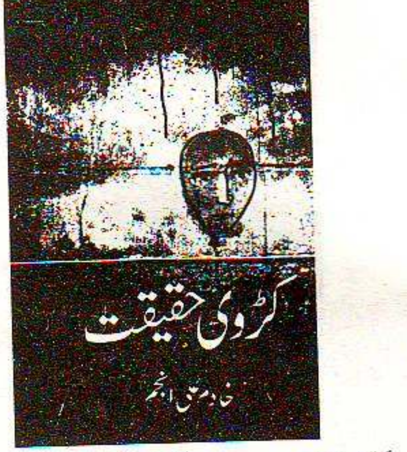

کتاب کا نام : کڑوی حقیقت
مصنف کا نام : خادم علی انجم
قیمت : 200 روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن

ہر انسان کی اپنی ذات بے حد وسیع و عریض ہوتی ہے۔ یہی سب ہے کہ جو لوگ اپنی ذات کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں اور انہیں دوسروں کی ہرگز ہرگز پروا نہیں ہوتی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ کائنات اکبر چھوڑ کر کائنات اصغر میں دلچسپی لینا کہاں کی دانائی ہے۔ تاہم یہ بات محل نظر رہے کہ کائنات اکبر فتح کر لینے کے بعد کچھ لوگ کائنات اصغر کی تسخیر کا ارادہ باندھتے ہیں۔ یہ لوگ تخلیق کار کہلاتے ہیں اور دوسروں کی ذات میں دلچسپی لے کر دراصل اپنی ذات کی تکمیل کرتے ہیں۔ خادم علی انجم صاحب بھی ان تخلیق کاروں میں شامل ہیں جنہوں نے دوسروں کی کہانیوں کو اپنی کہانی بنا کر پیش کر دیا ہے۔ ان کا یہ طرز عمل دلچسپ بھی ہے اور خوش گوار بھی۔

جناب خادم علی انجم ایک صاحب بصیرت تخلیق کار ہیں۔ زندگی کے معاملات و مسائل کو عمیق نگاہی سے دیکھنا ان کا شیوہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تخلیقی آنکھ وہ مناظر دیکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جہاں پہنچنا کور نگاہوں کا مقدر ہی نہیں ہے۔ انہوں نے زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو سادگی اور سلاست سے بیان کر دیا ہے اور اسی باعث ان کی تخلیقی کہانیاں قارئین کے قلوب و اذہان کو معطر و منور کرنے کا باعث ہیں۔ انجم صاحب کی کہانیوں کے کردار ہمارے سماج کے جاوداں کردار ہیں کہ ہماری ان سے روزانہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہر کردار دوسرے کردار کی تعمیر و تشکیل میں مستعد دکھائی دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خادم علی انجم کی ہر کہانی اپنا ایک مکمل تاثر چھوڑتی ہے اور خود ایک اکائی محسوس ہوتی ہے۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر جناب خادم علی انجم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اگر انہوں نے لکھنے پڑھنے کی مشق جاری رکھی تو انہیں بہت جلد شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ مل جائے گی۔

کتاب کا نام : عہد عنایت
مصنف کا نام : خادم علی انجم
قیمت : 200 روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : حسن عباسی

بہت عظیم ہیں وہ لوگ جو اپنی سیرت، کردار اور عمل سے معاشرے میں مثبت تبدیلی لا رہے ہیں۔ جو علامہ اقبال اور قائداعظم کے فرمودات کے مطابق ملک و ملت کے سپوتوں کی تربیت کر رہے ہیں۔ ان میں ایک نام پروفیسر ڈاکٹر عنایت علی بھٹی صاحب کا ہے جن کی باغ و بہار اور ہمہ جہت شخصیت نے کئی نسلوں کی ذہنی و روحانی آبیاری کی ہے۔ جن میں سے اب بے شمار پودے تناور درخت بن چکے ہیں اور اپنے اپنے شعبوں میں چھاؤں تقسیم کر رہے ہیں۔ میں یہاں اپنا ایک شعر ڈاکٹر صاحب کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

اُس کی بانہیں تو کشادہ رہتی ہیں سب کے لیے
پیڑ سے کہنا نہیں پڑتا محبت چاہیے

پروفیسر خادم علی انجم کا نام ادبی اور تعلیمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ معروف شاعر اور افسانہ نویس ہیں۔ اب ڈاکٹر عنایت علی بھٹی کی زندگی سے متعلق کتاب لکھ کر انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو ناقدین فن کریں گے۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ محبت اور عقیدت میں گندھی ہوئی یہ نثر پڑھنے کے بعد نہ صرف قاری ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا معترف ہو جاتا ہے بلکہ اُس کے دل سے ڈاکٹر صاحب اور مصنف کے لیے ڈھیروں دُعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو شرف قبولیت بخشے۔ (آمین)

کتاب کا نام : کوثر رحمت
مصنف کا نام : عبدالسلام ثمر
قیمت : 200 روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ریاض مجید

بحیثیت مجموعی ثمر کا یہ اوّلین نعتیہ مجموعہ مقدار اور فنی محاسن کے حوالے سے ایک اہم و قیع اور قابل ذکر پیش رفت ہے۔ اگرچہ ان کے اسلوب کی جڑیں اُردو نعت کے کلاسیکی انداز سے جڑی ہوئی ہیں۔ مگر انہوں نے اس میں جگہ جگہ اپنے جذبات کی سچائی کے حوالے سے تازگی پیدا کی ہے۔ فن میں تازگی کا تعلق باطن کی نادرہ کاری سے ہوتا ہے۔ جب نعت گو نعت کے موضوعات کو نئے انداز اور وژن سے دیکھتا ہے تو اس کے اظہار میں بھی تازگی کا جوہر اُبھرتا ہے۔ ثمر کی شاعری میں یہ

عناصر جگہ جگہ موجود ہیں۔ان کا ایک شعر ہے:

آقاؐ سمجھ کے تحفہ یہ کر لیجیے قبول
آیا ہوں لے کے اشکوں کی سوغات یارسولؐ

اللہ کرے ان کا یہ مجموعہ نعت شائقین وقارئین نعت میں مقبول اور دربارِ رسالت مآب ﷺ میں قبول ہو۔(آمین)

کتاب کا نام : نیا زمانہ نئی کہانیاں
مصنف کا نام : نائیک عنصر علی بریار
قیمت : 300روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : حسن عباسی

جینوئن تخلیق کار ہمیشہ مثبت سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ اپنے اردگرد رونما ہونے والی کسی بھی منفی تبدیلی پر وہ شکوہ کناں ہی نہیں بلکہ نوحہ کناں بھی ہوتا ہے۔ یہ نوحہ کبھی شعر کبھی نثر کی صورت میں اُس کے اندر سے نکلتا ہے اور کسی چشمے کی طرح پیاسی زمینوں کو سیراب اور شاداب کرتا چلا جاتا ہے۔عنصر علی بریار ایک حساس اور جینوئن نثر نگار ہے۔ اس کی نظریں بیک وقت ماضی اور مستقبل پر لگی ہوئی ہیں۔ایک طرف وہ ماضی کی راہداریوں سے ہوتا ہوا اُس وادی میں پہنچ جاتا ہے جہاں عظمت کا تاج انسانیت کے سر پر رکھا ہوا ہے اور اُس کے دست و بازو امن اور سلامتی کے پرچارک ہیں۔ زندگی کا پیرہن کسی حوالے سے بھی داغدار نہیں۔ دوسری طرف عنصر علی بیک وقت مستقبل کی سیڑھی پر چیونٹیوں اور دیمک کی طرح رینگتی خلقت کا انجام دیکھ رہا ہے اور ماضی کی مٹتی ہوئی تابندہ اقدار پر افسردہ ہی نہیں بلکہ حال میں حضرتِ انسان کے مجرمانہ، فاسقانہ اور ظالمانہ رویوں پر نوحہ کناں بھی ہے۔

''نیا زمانہ نئی کہانیاں'' اگرچہ عنصر علی بریار کی پہلی کتاب ہے مگر میں اسے اُس کی پہلی کتاب تسلیم کرنے سے انکاری ہوں جس طرح بزرگی اور دانائی کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا اسی طرح پہلی کتاب کا تعلق بھی پہلی بار چھپنے سے نہیں ہوتا۔ بہت سے شاعر اور ادیب اپنی دوسری تیسری اور چوتھی کتاب چھپوا کر سینئر بن جاتے ہیں مگر جب مطالعہ کیا جائے تو وہ ان کی پہلی کتاب ہی لگتی ہے۔عنصر کی نثر نہایت آسان اور کہانی لکھنے کا انداز بہت سادہ اور شگفتہ ہے۔ اُس نے اپنی کہانیوں کو منفرد اور جدید بنانے کے چکر میں علامتی اسلوب کا سہارا نہیں لیا اور میرے خیال میں یہی اُس کی کامیابی ہے۔ اس کی تقریباً تمام کہانیوں کا خمیر ہماری روزمرہ کی زندگی سے اُٹھا ہے اس لیے پڑھتے ہوئے ہمیں بیگانگی کا احساس بالکل نہیں ہوتا بلکہ بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

عنصر علی بریار اپنے اور قاری کے غم غلط کرنے کے لیے کوئی سہانا خواب نہیں دکھاتا اور نہ ہی اُس کی تحریر کہیں قہقہہ بنتی ہے۔ بلکہ وہ زندگی کی تلخیوں، حادثات اور دُکھوں پر کہانی بنتے ہوئے خود بھی گہری اُداسی میں ڈوب جاتا ہے اور قاری کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھی اس اُداسی میں ڈوبنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے اس کتاب کی جتنی کہانیاں پڑھیں ہیں وہ مجھے اس حوالے سے بہت اچھی لگی ہیں کہ ایک تو ان میں ہمارے معاشرے کے بھیانک اعمال کا عکس ہے۔ دوسرا ہر کہانی کا انجام ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر ہم کس سمت جا رہے ہیں اور ہماری منزل کیا ہے؟ میں انہیں اصلاحی کہانیاں تو نہیں کہوں گا البتہ یہ قاری میں ایک مثبت سوچ جنم دینے والی کہانیاں ضرور ہیں۔ رشتوں کے حوالے سے بھی عنصر کی تحریریں بہت زیادہ جذباتی اور منفرد ہیں جسے اس کتاب کی اضافی خوبی کہا جاسکتا ہے۔

میں نائیک عنصر علی بریار کو اس کتاب کی اشاعت پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں وہ اسی طرح اپنی خوبصورت کہانیاں نذرِ قارئین کرتے رہیں گے۔

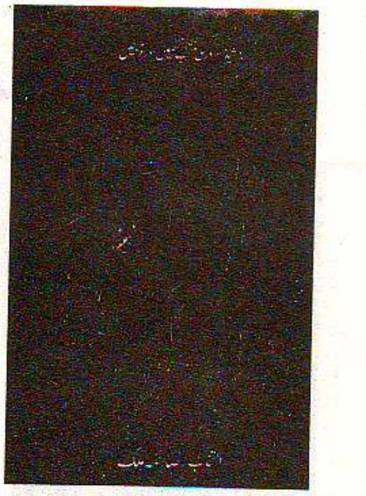

کتاب کا نام : آخری پتہ خزاں کا
انتخاب : صائمہ ملک
قیمت : 200روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : شہزاد ملک

جمشید مسرور بطور شاعر پاکستان اور ناروے کے حلقوں میں یکساں مقبول ہیں وہ طویل عرصہ سے ناروے میں علم و ادب کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ مختلف زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور کئی زبانوں میں اُن کی کتب شائع ہو چکی ہیں۔اُن کی شاعری سے انتخاب معروف شاعرہ صائمہ ملک نے کیا ہے جس میں جمشید مسرور کی نمائندہ غزلیات اور نظموں کو شاعرہ نے یکجا کر دیا ہے۔''آخری پتہ خزاں کا'' اپنی شاعری اور اشاعت کے باعث ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جسے بطور تحفہ دیا جاسکتا ہے۔

کتاب کا نام : ارادہ
مصنف کا نام : علی یاسر

قیمت : 150روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : شہزاد ملک

علی یاسر کا شمار نوجوان نسل کے مقبول شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے اسلوب اور موضوعات کے لحاظ سے منفرد شاعر ہیں۔ اُن کی غزل نے نہایت قلیل عرصہ میں اپنی علیحدہ شناخت بنائی ہے وہ بڑے چست اور رواں مصرعے کہتے ہیں۔ عموماً غزل کے تمام شعر اچھے ہوتے ہیں انہوں نے اپنے معیار کو بہتر بنائے رکھا۔ اس لیے اُن کا پہلا شعری مجموعہ آج کل کے شعراء کے برعکس قدرے تاخیر سے شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں نہایت سنجیدگی سے لیا گیا۔ ''ارادہ'' پر کسی معتبر شاعر کی رائے نہ ہونا بھی علی یاسر کی ''خود اعتمادی'' کا مظہر ہے۔ شعری حوالے سے علی یاسر کا مستقبل بہت تابناک دکھائی دیتا ہے۔

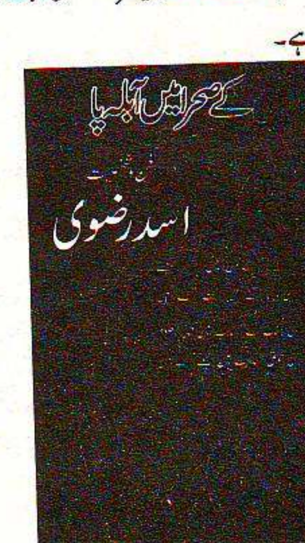

کتاب کا نام : فن کے صحرا میں آبلہ پا
مرتب کا نام : رائے عابد علی
قیمت : 175روپے
ناشر : طلوعِ اشک پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : شہزاد ملک

اسد رضوی کا شمار مقبول شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ شعری مجموعے اور متعدد انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ وہ طویل عرصہ سے پیرس میں مقیم ہیں جہاں وہ علم و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔ اُن کی فن و شخصیت پر نوجوان شاعر رائے عابد علی نے ''فن کے صحرا میں آبلہ پا'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں اسد رضوی کی فن و شخصیت سے متعلق ملک کے نامور ادیبوں کی تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ ان میں منیر نیازی، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، افتخار عارف، احمد ندیم قاسمی، حسن عباسی اور دیگر ادیبوں کی آراء ہیں۔ کتاب کی اشاعت کا اہتمام نہایت سلیقے سے کیا گیا ہے۔

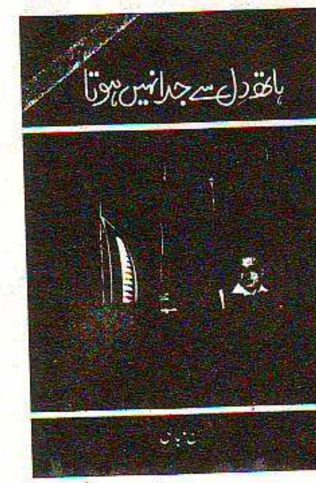

کتاب کا نام : ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
مصنف کا نام : حسن عباسی
قیمت : 300روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : شہزاد ملک

''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' معروف شاعر حسن عباسی کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ اس سے قبل اُن کا پہلا سفرنامہ ''محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو'' شائع ہو چکا ہے۔ شاعری کے بعد سفرنامہ نگاری میں بھی انہوں نے اپنے منفرد اسلوب کو قائم رکھا ہے۔ اُن کے سفرنامے شاعرانہ نثر میں لکھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں تو مکمل پیراگراف پر نظم کا گمان گزرتا ہے۔ ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' اُن کا سفرنامہ یو۔اے۔ای اور دوحہ کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ حسن عباسی ان ریاستوں میں عالمی مشاعروں میں شرکت کے لیے گئے اور وہاں قیام کے دوران انہوں نے ان خوبصورت ریاستوں کی بھرپور سیاحت کی۔ وہاں کے کلچر کو بہت نزدیک سے دیکھا اور پھر اُسے خوبصورت نثر میں لکھ کر نذرِ قارئین کر دیا۔ اُمید ہے یہ سفرنامہ اپنے شاعرانہ اسلوب کے سبب رجحان ساز ثابت ہوں گے۔

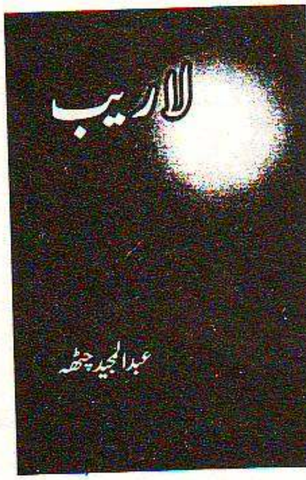

کتاب کا نام : لاریب
مصنف کا نام : عبدالمجید چٹھہ
قیمت : 200روپے
ناشر : نستعلیق پبلی کیشنز
تبصرہ نگار : اقبال راہی

عبدالمجید چٹھہ کا ہر شعر عشق رسول کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ دیارِ رسولؐ کی جو منظر کشی کرتے ہیں وہ عقیدت کے زینے اور حقیقت نگاری کی منزل کی خبر دیتی ہے۔ اس سے پیشتر اُن کی چار کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ''لاریب'' ان کی پانچویں کتاب ہے۔ کتاب کیا جواہر پارے ہیں جن کے حرف حرف میں تجلی کی کرنیں اور عقیدت کی مہک بسی ہوئی ہے۔ وہ شعر اس روانی سے کہتے ہیں کہ اتنی جلدی گفتگو بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ کمال بہت کم لوگوں کو حاصل ہے اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ عبدالمجید چٹھہ کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ چٹھہ صاحب خوش فکر بھی ہیں، خوش گلو بھی ہیں اور سچے عشق رسولؐ کے حوالے سے خوش نصیب بھی۔ وہ اچھے انسان ہیں اور انہیں اچھا کہنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ وہ علم دوست بھی ہیں انسان دوست بھی اور ادب دوست بھی۔ اُن سے میری نیاز مندی کا حوالہ مضبوط بھی ہے، مستحکم بھی اور خوش نما بھی۔ میں ان کی سلامتی ترقی و کمال اور درازیٔ عمر کے لیے حسب سابق دُعا گو ہوں۔

کتاب کا نام : اے پاک نسل عظیم بچو!

مصنف کا نام : نجمہ یاسمین یوسف

قیمت : 150روپے

ناشر :

تبصرہ نگار : کرامت بخاری

بچپن ایک حسین خواب ہے۔ ایسا حسین خواب کہ طلسم گاہ خواب کا سراب اور ایسا سراب کہ جو کبھی پایاب نہیں ہوتا۔ نجمہ یاسمین یوسف اس طلسم گاہ خواب سے سنہری تعبیریں اور تصویریں بناتی ہیں۔ یہ سنہری تعبیریں اور تصویریں ہی ان کی یہ منظوم تحریریں ہیں جو بچوں کے ذہن و دل زندگی کے آب و گیاہ جنگل اور لق و دق صحرا میں پیار، محبت، اُنس، یگانگت، مہر و وفا، صبر و رضا اور درس وفا جیسا زاد راہ مہیا کرتی ہیں۔ وہ روزمرہ، عام فہم، سلیس اور سادہ طرزِ بیان سے اپنے ننھے منے قاری کا دل موہ لیتی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنا، سوچنا، زندہ رہنا اور انہیں آسودگی اور طمانیت سے ہمکنار کرنا عبادت کی طرح ہے۔ جناب رسولِ خدا کے فرمان کا مفہوم ہے کہ ''جو اپنے سے بڑوں کا ادب اور اپنے سے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں'' لہٰذا بچوں کی اصلاح و تربیت ہم سب کو زندہ قوم اور پائندہ قوم بنا سکتی ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب بچوں کے ادب پہ لکھی جانے والی نظموں میں ایک گلدستے کی صورت ہوگی اور یقیناً چمنستان ادب نونہالاں میں ایک تازہ پھول کا اضافہ قرار پائے گا۔ آیئے اس طلسم گاہ خواب و خیال کی سیر کریں۔ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کو اکٹھا دیکھیں۔ زیست کے لمحوں کو سجائیں اور ذہنی آسودگی پائیں۔

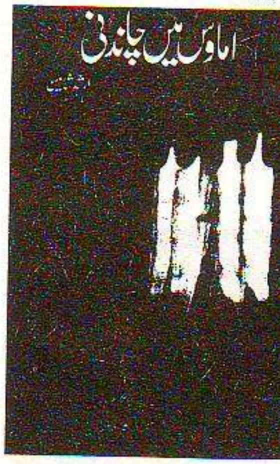

کتاب کا نام : اماوس میں چاندنی

مصنف کا نام : ارشد شاہین

قیمت : 250روپے

ناشر : محمد حنیف طٰہٰ

تبصرہ نگار : خالد احمد

''ارشاد شاہین'' اتقا اور ممتا کی ایک نادر ترکیب کا حامل مردِ خدا ہے۔ اس کی شاعری اسی ''نادر ترکیب'' کا جداگانہ اظہار ہے اور اس کے اشعار وقتاً فوقتاً ایک مردِ خدا کی دعا کا اثر رکھتے ہیں۔ کاش! اس بستی میں شعر و ادب کا چرچا ہوتا اور اب تک اس بستی کے تن مردہ میں جان پڑ سکتی۔ کاش یہ شعر و ادب سے بے گانہ بستی جان سکتی کہ وہ کن لوگوں کے لیے دن کالے اور راتیں سفید کرتا رہا ہے۔ وہ انہیں جھنجھوڑ کر جگانا نہیں چاہتا۔ وہ تو ان کے دکھوں پر پگھل پگھل جاتا ہے۔ وہ بستی چھوڑ کر جا رہا ہے تاکہ اس بستی کے لیے نئے خواب لا سکے اور اس بستی کے باسی ان کی ''تعبیر'' کے لیے گھروں سے نکل سکیں اور یہ بستی ارتقا آشنا ہو سکے! آمین

بیت بازی کی مقبولیت کے بعد
شکیلہ ستارہ کا بیت بازی کے حوالے سے
ایک اور منفرد انتخاب
جدید بیت بازی
شائع ہوگیا ہے
قیمت : -/200روپے
اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
ناشر: پاکستان پبلی کیشنز

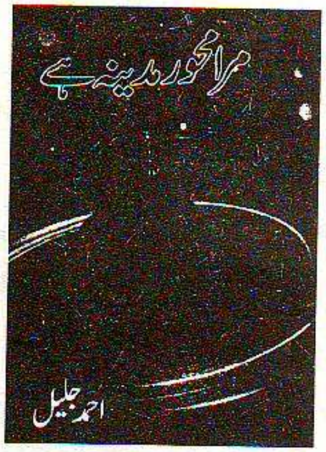

کتاب کا نام : مرا محور مدینہ ہے

مصنف کا نام : احمد جلیل

قیمت : 300روپے

ناشر : القلم پبلشرز

تبصرہ نگار : سیّد امتیاز علی شاہ

معروف شاعر احمد جلیل کا دوسرا نعتیہ مجموعہ دیدہ زیب ٹائٹل، معروف شعراء، ادباء اور دانشوروں کی آراء کے ساتھ شائع ہوگیا ہے۔ اس نعتیہ مجموعے میں جہاں جذبہ عشق رسول ﷺ کو مہمیز کرنے والی خوبصورت اور ایمان افروز نعتیں شامل ہیں وہاں اس کے شراکت دار وہ مجموعہ ہائے سلام بھی ہیں جو بارگاہِ امام عالی مقام میں نہایت محبتوں اور عقیدتوں سے پیش کیے گئے ہیں۔ بھرپور تاثر کے حامل اس نعتیہ مجموعے کو القلم پبلشرز الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔ احمد جلیل کا موبائل نمبر 0321-6951588 ہے۔ اس خوبصورت مجموعہ سے ایک ایمان افروز نعتیہ شعر نذرِ قارئین ہے۔

آنسوؤں سے نہ ہو وضو جب تک
آپ ؐ کی نعت ہی نہیں ہوتی

نامہ ہائے احباب

پیارے حسن عباسی! سلام مسنون

سدا خوش رہو۔ ''ارژنگ'' دستی ملا۔ خوب ہے۔ خوبصورت ہے، حسب ارشاد کچھ چیزیں ارسال ہیں۔

سپردم بہ تو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

والسلام

آپ کا مخلص

ناصر زیدی

***

برادرِ محترم! حسن عباسی صاحب تسلیم!

آج ارژنگ کے دو رسالے موصول ہوئے۔ پاکستان میں آپا دھاپی کے اس دور میں بھی آپ نے اخلاقی اور علمی، ادبی قدروں کی اقدار کو سربلند رکھا۔ آپ کے ہاں قدیم روایت کا احترام اور معیار باعث صد تحسین ہے۔ ارژنگ ماشاءاللہ خوب صورت اور معیاری پرچہ ہے۔

والسلام

محمد اقبال اختر

کوپن ہیگن/ڈنمارک

***

عزیز شعرونغمہ حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم! بڑی خوشی کی بات ہے آپ ارژنگ کے صاحب ادارت ہوئے۔ ارژنگ کی آب و تاب دِل میں نور ونور ہو رہی ہے۔ آپ کو اپنی کتاب ''درکنار'' بھیجتا ہوں شاید آپ نے نہیں دیکھی۔ اگر ممکن ہو تو شاعری میں اس کی دو تین غزلیں ایک دو نظمیں لگا دیں۔ تعارفاً احمد ندیم قاسمی مرحوم کے مقدمے سے کچھ جملے لے لیں۔ جیسے آپ کی مرضی ہے۔ ارژنگ کے لیے ایک نعت بھیجتا ہوں۔ میں نے بابر صاحب ایم پی اے کو میاں چنوں ارژنگ کے خصوص میں توصیفی عریضہ بھیجا ہے۔ اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ ارژنگ دوستو سے میرا اسلام کہیں۔ عامر بن علی آئے تو انہیں بہت بہت پوچھیں۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف صاحبہ اور ابرار ندیم صاحب گوشہ چشمے ادھر کرتے ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آپ کی شاعری کا منفرد سٹائل میرا من بھاتا ہے۔

مخلص

آصف ثاقب

ایبٹ آباد

***

جناب عامر بن علی و حسن عباسی صاحب! آپ نے نہایت مہربانی فرمائی۔ ماہنامہ ارژنگ مارچ ۲۰۱۲ء بھجوایا۔ موسم بہار کے حوالے سے ٹائٹل بہت خوبصورت ہے۔ اس ماہنامہ میں اتنا مواد موجود ہے کہ ایک نشست میں پڑھنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ ویسے بھی اب زندگی کو بڑھاپے کی نذر کر چکا ہوں۔ ہمت جواب دے جاتی ہے جب کبھی پڑھنے یا لکھنے بیٹھتا ہوں۔ اب تک تو اتر سے ''تخلیق'' میں چھپ رہا ہوں۔ عرصہ بیس سال لاہور واسا (LDA) میں رہا ہوں۔ فی الحال پانچ غزلیں بھجوا رہا ہوں۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں چھاپ دیں۔ آئندہ بھی کچھ نہ کچھ بھجواؤں گا۔

اجازت چاہتا ہوں۔

خیر اندیش

آفتاب راجا

***

محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم!

ماہنامہ ''ارژنگ'' ایک دوست کے ہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پسند آیا۔

آپ کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ چند غزلیں ''ارژنگ'' کے لیے ارسالِ خدمت ہیں۔ اگر پسند آئیں تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے دیجیے ممنون ہوں گا۔

احقر

نصرت صدیقی

فیصل آباد

***

محترم جناب عامر بن علی (مدیر اعلیٰ)

محترم جناب! حسن عباسی (مدیر)

تسلیمات!

اُمید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے۔ میں یہاں آپ کی صحت و سلامتی اور توفیقات میں ترقی و اضافے کے لیے دعا گو ہوں۔ ''ارژنگ'' موصول ہوا جس کے لیے ممنون ہوں۔ اُمید ہے یہ کرم فرمائی جاری رہے گی۔ اس لیے کہ اس بہانے آدھی مگر حقیقی ملاقات کی صورت نکلتی رہے گی۔ کیونکہ عرصہ دراز سے آپ کی تخلیقی عظمت کا معترف ہونے کے باوجود ملاقات کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہ آ رہا تھا جو کہ بتوسط برادرم علی رضا ممکن ہوا۔

گزشتہ دنوں ساہیوال میں ایک ذیشان ''اُردو کانفرنس'' کے موقع پر اُردو کے حوالے سے ایک نظم بعنوان ''داستانِ اُردو'' تحریر کی تھی۔ ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ ایک تازہ احساس کے ساتھ پسند آئے گی۔ غزلیں آئندہ ارسال

خدمت کروں گا۔فقط

دُعاگو

غضنفر عباس سیّد

شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج/ساہیوال

جنابِ عامر بن علی صاحب! السلام علیکم!

طویل عرصہ سے ایک ایسے ادبی میگزین کی کمی محسوس ہو رہی تھی جو عام روش سے ہٹ کر ہو اور جس میں نئے دور کے نئے انداز میں لکھنے والے شعر و ادب سے وابستہ احباب کی تحریریں موجود ہوں۔ ہر ماہ باقاعدگی سے ''ارژنگ'' کا ملتے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اور حسن عباسی ''ارژنگ'' کے حوالے سے کس قدر سنجیدہ ہیں۔ نت نئے آئیڈیاز کے ساتھ ''ارژنگ'' کا ہر شمارہ نئی آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور ''فنون'' اور ''اوراق'' کے بند ہو جانے سے یا فنون کے کبھی کبھی مارکیٹ میں آنے سے جو خلا پیدا ہوا، آنے والے وقتوں میں ادبی دنیا کے لوگ محسوس کریں گے کہ ''ارژنگ'' نے یہ خلا کسی حد تک پورا کر دیا۔

عامر بن علی صاحب آپ سے ایک گزارش کرنی تھی کہ آپ کچھ نامور مصوروں کے خاکے بھی اُس کے تعارف کے ساتھ ''ارژنگ'' میں شائع کیا کریں، جن میں جناب اسلم کمال، ساجد قریشی، جناب خیالی، عظمت شیخ اور ایسے ہی بہت سے نام شامل ہیں۔

اُمید ہے حسن عباسی اور آپ کی محنت سے آنے والے دنوں میں ''ارژنگ'' کے شاہکار شمارے ادبی قارئین کو پڑھنے کو ملیں گے۔ والسلام

مخلص

حافظ مظفر محسن

محترم جناب حسن عباسی صاحب! ابرار ندیم صاحب!

سلام مسنون! سب سے پہلے اس بات کی پرخلوص مبارک باد کہ آپ احباب کی زیرِ نگرانی ماہنامہ ''ارژنگ'' کا رنگ و روپ دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ یقیناً اس مشاطگی میں آپ لوگوں کی پرخلوص مساعی کا عمل دخل ہے۔ بقول اقبالؒ

ع معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

میرا نعتیہ مجموعہ ''مرا محور مدینہ ہے'' شائع ہو گیا ہے۔ اس کا ایک ایک نسخہ آپ دونوں احباب کی نذر ہے۔ اس پاکیزہ مجموعہ سے ایک نعت اور اس کی اشاعت سے متعلق خبر بھی برائے ارژنگ ارسال کر رہا ہوں۔ کتاب پر نستعلیق پبلی کیشنز کا نام بھی شائع کیا ہے۔ جلد ہی مزید کتب بھی ارسال کروں گا۔ ان شاءاللہ!

اور...... کہنا یہ بھی ہے کہ آپ کی محبتوں کا ہمیشہ مقروض رہتا ہوں۔

آپ کی چاہتوں کا ہوں مقروض
قرض مجھ سے ادا نہیں ہوتا

یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اس نعتیہ مجموعہ سے متعلق آپ کی قیمتی آراء کا انتظار رہے گا۔ آخر میں میرا اور مسعود احمد کا پرخلوص سلام۔

احمد جلیل

سیکرٹری جنرل حلقہ ادب

اوکاڑہ

برادرِ مکرم حسن عباسی! اسلام مسنون!

اُمید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ کچھ نئی چیزیں یک مشت ارسالِ خدمت ہیں۔ ان کے ساتھ جو سلوک فرمائیں۔ اگر ایک ساتھ کسی شمارے میں آ جائیں تو بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

شہاب صفدر

اسلام آباد

خدا سے ڈرتی ہوں پر ناخدا سے میں نہیں ڈرتی
دِیا اپنا جلاتی ہوں ہوا سے میں نہیں ڈرتی
میں ڈرتی ہوں زمانے سے کسی تازہ فسانے سے
پکارو تو چلی آؤں صدا سے میں نہیں ڈرتی
بہت سے سانحے دیکھے بہت سے حادثے گزرے
کسی محشر کسی اب کربلا سے میں نہیں ڈرتی
مجھے منظور ہے جو فیصلہ مجھ کو سناؤ تم
محبت جرم ہے تو پھر سزا سے میں نہیں ڈرتی
ستارہ اچھا لگتا ہے دیے پر ہاتھ رکھ لینا
اندھیروں میں رہی ہوں پر ضیا سے میں نہیں ڈرتی

شکیلہ ستارہ

کتاب: تنہا رہنا سیکھ لیا ہے

شاعر: ڈاکٹر جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

انتخاب: نرگس

کیا لازم تھا ترکِ تعلق کرتے ہم
الزامات کی زد میں خود کو دھرتے ہم
آئینے کو اب تو دیکھ نہیں سکتے
اپنے آپ سے کب تھے اتنا ڈرتے ہم
آ جاتا ہے اپنے ہاں وہ کبھی کبھی
جی اُٹھتے ہیں اُس کو دیکھ کے مرتے ہم
ضبط کا دامن تھام لو یارو دُنیا کو
اچھے خاک لگیں گے آہیں بھرتے ہم
غم کے دریاؤں میں اکثر رہتے ہیں
لحہ لحہ ڈوبتے اور اُبھرتے ہم
کاش ہوا کرتے آئینہ ہم اس کا
جونہی سنورتا وہ تو ساتھ سنورتے ہم
جعفر حسن مبارک جیسے ہیں ہم بھی
جو کہتے ہیں اُس سے نہیں مکرتے ہم

دن اُجالوں نے یوں تاریک بنائے کیوں تھے
ہم اگر جسم نہ تھے، اپنے ہی سائے کیوں تھے
فرض کر لیں کہ وہ حاکم تھا رعایا پرور
لوگ اس شہر کے اس درجہ ستائے کیوں تھے
دیکھ کر اُس کی رعونت کو، سوال اُٹھتا ہے
ناز اُس شخص کے لوگوں نے اُٹھائے کیوں تھے
اُس کے آنے سے جو اُترے تھے مرے آنگن میں
میرے آنگن نے ستارے وہ چھپائے کیوں تھے
دیکھ کر حشر چمن زار، خیال آتا ہے
پھول مٹی نے مری اتنے اُگائے کیوں تھے
عشق صاحب نے کہا سن کے ہماری بابت
ایسے دیوانے مرے دشت میں آئے کیوں تھے
بات ہے حسن تعلق کی سو یہ مت پوچھو
آنکھ میں خواب مرے اُس نے سجائے کیوں تھے

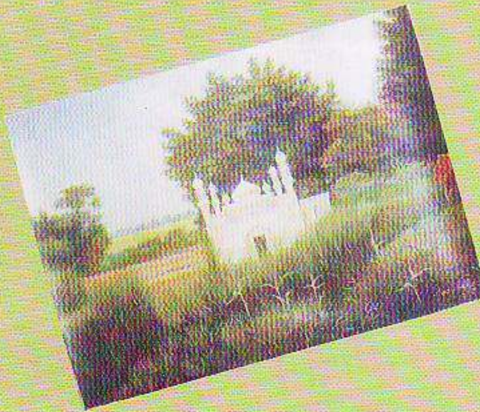

غزالی

غزالی معروف شاعر اور نامور آرٹسٹ ہیں۔ وہ بھگت پورہ، گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی شاعری اور مصوری سے لگاؤ تھا۔ 1986ء میں مصوری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ابتداء میں اپنے ہی گاؤں کے استاد عبدالخالق صنم سے مصوری کی باقاعدہ اصلاح لی۔ بعد میں ملک کے ممتاز مصور رانا محمد الیاس سے مصوری کے میدان میں بہت کچھ سیکھا۔ غزالی مصوری میں صادقین، گل جی، اُستاد اللہ بخش، سردار قلمکار، محمد کمال، پکاسو اور لیونارو ڈونچی سے متاثر ہیں۔

وہ آئل پینٹ، واٹر کلر، پین ورک، اور پنسل شیڈز کا استعمال کرتے ہیں جبکہ پورٹریٹ اسکیچز، وال پینٹنگ اور لینڈ اسکیپ میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ بقول ڈاکٹر جواز جعفری ''غزالی فن کے بحرِ بیکراں میں ڈوب کر صراطِ زندگی پانے کے لیے کوشاں ہیں''۔ غزالی بھی لیونارڈو ونچی کی طرح (مونالیزا) جیسا کوئی شاہکار بنا کر خود کو امر کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ ان کو صدیوں تک یاد رکھ سکیں۔

پریس کلب خانیوال اور شعیب الرحمٰن ادبی فورم کے زیراہتمام

عامر بن علی کی گبریلا مسترال اور پابلونرودا کے ہسپانوی سے اردو زبان میں کیے گئے تراجم پر مبنی کتاب ''محبت کے دو رنگ'' کی تقریب پذیرائی

اسٹیج پر لطیف انور، آصف علی فرخ، عامر بن علی، قمر رضا شہزاد اور سیّد مصدق شاہ تشریف فرما ہیں
جبکہ صدر پریس کلب طاہر نسیم خطاب کر رہے ہیں۔

Read Arxang Online.

WWW.millat.com
WWW.amirbinali.com